نعت نگر کا باسی

مؤلف

سیّد صبیح الدین رحمانی

اقلیمِ نعت

کراچی

نام کتاب	:	نعت نگر کا باسی
مؤلف	:	سیّد صبیح الدین رحمانی
اہتمام	:	نعت ریسرچ سینٹر، کراچی
اشاعتِ اوّل	:	۲۰۰۸ء
کمپوزنگ	:	حارث لیزر کمپوزنگ، کراچی۔ 0300-2499031
ناشر	:	اقلیم نعت، کراچی
قیمت	:	۱۵۰/ روپے

نام کتاب : نعت نگر کا باسی
مؤلف : سیّد صبیح الدین رحمانی
اہتمام : نعت ریسرچ سینٹر، کراچی
اشاعتِ اوّل : ۲۰۰۸ء
کمپوزنگ : حارث لیزر کمپوزنگ، کراچی۔ 0300-2499031
ناشر : اقلیم نعت، کراچی
قیمت : ۱۵۰/روپے

انتساب

تحریکِ ''نعت رنگ'' کو اپنی سرپرستی سے
اعتبار بخشنے والے

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی (مرحوم)

کے نام

فہرست

فہرست

سیّد صبیح الدین رحمانی

نعت نگر کا باسی

نعتیہ شاعری کی ابتدا تو اردو کی اوّلین شعری تخلیق مثنوی کدم راوٗ پدم راوٗ سے ہی ہوگئی تھی، جو ۸۲۵ تا ۸۳۸ ہجری کی تصنیف بتائی جاتی ہے...لیکن اس مقدس صنفِ سخن کی معیاری تحسین یعنی تربیت یافتہ ذہن کا حرفِ نقد بہت بعد میں حوالۂ قرطاس کیا گیا... ادب شناسوں کی اس مجرمانہ غفلت کے بہت سے عوامل تھے۔ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد جو ادبی منظرنامہ بنا اس میں ترقی پسندی کے نام پر ظلمت پرستی کے آثار نمایاں رہے اور ادبی افق پر مذہب بیزاری کی سیاہ چادر تنی رہی۔

بہ قول حمایت علی شاعر:

اک عمر سے ہے جہل پہ اپنے، گمانِ علم

لیکن ایسی فضا میں بھی بعض مجاہدینِ ادب نے دینی تحکمات اور شعائر کے حوالے سے اپنی ادبی تخلیقات کو جمیل بنایا اور بہ بانگِ دُہل دین کا پرچار کیا۔ ایسے راسخ العقیدہ مسلمان تنقیدنگاروں میں ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کا نام سرِفہرست ہے۔ الحمدللہ جس طرح علامہ اقبال کو جلوۂ دانشِ فرنگ خیرہ نہ کرسکا، اسی طرح ڈاکٹر صاحب کو ترقی پسندی کا گم راہ کن نام (جس میں الحاد پوشیدہ تھا) متاثر نہ کرسکا۔

پروفیسر مرزا محمد منور کی کتاب 'ایقانِ اقبال' پر تبصرہ کرتے ہوئے جو کچھ کشفی صاحب نے مرزا صاحب کے لیے لکھا ہے اور ان کے طرزِ نگارش کے جو محاسن گنوائے ہیں وہ خود کشفی صاحب کی تحریر کا بھی جزوِ لاینفک ہیں...کشفی صاحب رقم طراز ہیں:

> پروفیسر محمد منور نے اقبال پر اب تک جو کچھ لکھا ہے اس کی بنا پر وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ذوقِ نظر، جمالیاتی حس، ادبی معیارِ نقد، اسلام و قرآن کے مطالعے، فکرِ جدید اور تجزیے کی قوت کی متاعِ وافر سے نوازے

گئے ہیں۔ (''آدمی اور کتاب''، ص۷۸)

اسی تحریر میں کشفی صاحب نے ان نقادوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جو اقبال کو ان کے فکری سرچشمے یعنی قرآن حکیم سے الگ کر کے اس بنا پر اشتراکیت کا شارح اور مناد قرار دیتے ہیں کہ اس کے ہاں زندگی کا حرکی تصور ملتا ہے... کشفی صاحب فرماتے ہیں:

> اسلام کے انقلاب آفریں مزاج اور روایات سے بے خبری یا پھر ان کے مفادات انھیں ایسی باتیں کہنے پر اُکساتے ہیں۔
>
> (''آدمی اور کتاب''، ص۷۷)

ڈاکٹر کشفی کا یہی صائب نظریۂ ادب جس کا سرا اسلام کی حرکی اقدار سے جڑا ہوا تھا، پاکستانی ادب میں دینی ادب کے فروغ اور نئی نسل کی ادبی تربیت کا ذریعہ بنا۔ الحمدللہ پچھلی تین دہائیوں سے پاکستان کے ادبی منظرنامے پر شاعری کا نعتیہ آہنگ گونج رہا ہے۔ نعتیہ تخلیقات جب زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے لگیں تو حرف وصوت کی اس عقیدت آمیز یک جائی میں ادبی محاسن تلاش کرنے اور نوواردانِ بساطِ نعت کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں بھی کشفی صاحب ہی پیش پیش نظر آئے بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنے ادبی قامت کے حوالے سے کشفی صاحب ہی واحد نقاد تھے جو نعتیہ ادب کی ترویج واشاعت میں اپنی قابلِ قدر ادبی رائے کے ذریعے ناقہ ہائے بے زمام کو سوے قطار لانے کی سعیِ جمیل فرماتے رہے۔ تقاریظ وتبصرے سے لے کر نعتیہ آہنگ کے پوشیدہ حسن کی کشود کے لیے لسانیاتی مباحث کا سلسلہ بھی اب تک نعت کے حوالے سے کسی نقاد نے نہیں چھیڑا تھا، اس ضمن میں بھی اوّلیت کا سہرا کشفی صاحب کے سر ہی رہا۔ اسلامی ادب کی تفہیم، تحسین اور پرکھ کے معاملے میں کشفی صاحب کا نام اس لیے سرِفہرست رہا کہ ان کی ادبی رائے مسلم، ادب شناسی غیر متنازعہ، مذہبی لٹریچر سے آگاہی لائقِ تقلید اور بلند ذوقی قابلِ رشک ہے۔ کشفی صاحب نے نعتیہ مجموعوں پر تقاریظ وتبصرے اور دیباچے لکھ کر گویا اردو کے معروف نقادوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ اپنے اس دعوے کو دلیل فراہم کرنے کی غرض سے جب میں نے نعت ریسرچ سینٹر میں موجود نعتیہ سرمائے پر اک سرسری سی نظر ڈالی تو مجھے کشفی صاحب کے نعت پر لکھے گئے مختلف مضامین، آرا اور فلیپ کے درج ذیل حوالے مل گئے اور اس طرح یہ مختصر مگر کارآمد فہرست سامنے آگئی۔

مختلف کتابوں میں لکھے گئے دیباچے اور پیش لفظ

شمار	مضمون	کتاب	مصنف	سن اشاعت	ناشر
۱۔	اسماء الٰہیہ کا آئینہ خانہ	صحیفہ حمد	لطیف اثر	۱۹۸۸ء	وقاص اکیڈمی، کراچی

گئے ہیں۔ (''آدمی اور کتاب''، ص۷۸)

اسی تحریر میں کشفی صاحب نے ان نقادوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا ہے جو اقبال کو ان کے فکری سرچشمے یعنی قرآن حکیم سے الگ کرکے اس بنا پر اشتراکیت کا شارح اور مناد قرار دیتے ہیں کہ اس کے ہاں زندگی کا حرکی تصور ملتا ہے...کشفی صاحب فرماتے ہیں:

> اسلام کے انقلاب آفریں مزاج اور روایات سے بے خبری یا پھر ان کے مفادات انھیں ایسی باتیں کہنے پر اُکساتے ہیں۔
> (''آدمی اور کتاب''، ص۷۷)

ڈاکٹر کشفی کا یہی صائب نظریۂ ادب جس کا سرا اسلام کی حرکی اقدار سے جڑا ہوا تھا، پاکستانی ادب میں دینی ادب کے فروغ اور نئی نسل کی ادبی تربیت کا ذریعہ بنا۔ الحمدللہ پچھلی تین دہائیوں سے پاکستان کے ادبی منظرنامے پر شاعری کا نعتیہ آہنگ گونج رہا ہے۔ نعتیہ تخلیقات جب زیورِ طباعت سے آراستہ ہونے لگیں تو حرف وصوت کی اس عقیدت آمیز یک جائی میں ادبی محاسن تلاش کرنے اور نوواردانِ بساطِ نعت کی حوصلہ افزائی کرنے والوں میں بھی کشفی صاحب ہی پیش پیش نظر آئے بلکہ کہنا چاہیے کہ اپنے ادبی قامت کے حوالے سے کشفی صاحب ہی واحد نقاد تھے جو نعتیہ ادب کی ترویج و اشاعت میں اپنی قابلِ قدر ادبی رائے کے ذریعے ناقہ ہائے بے زمام کو سوئے قطار لانے کی سعیِ جمیل فرماتے رہے۔ تقاریظ وتبصرے سے لے کر نعتیہ آہنگ کے پوشیدہ حسن کی کشود کے لیے لسانیاتی مباحث کا سلسلہ بھی اب تک نعت کے حوالے سے کسی نقاد نے نہیں چھیڑا تھا، اس ضمن میں بھی اوّلیت کا سہرا کشفی صاحب کے سر ہی رہا۔ اسلامی ادب کی تفہیم، تحسین اور پرکھ کے معاملے میں کشفی صاحب کا نام اس لیے سرِفہرست رہا کہ ان کی ادبی رائے مسلم، ادب شناسی غیر متنازعہ، مذہبی لٹریچر سے آگاہی لائقِ تقلید اور بلند ذوقی قابلِ رشک ہے۔ کشفی صاحب نے نعتیہ مجموعوں پر تقاریظ وتبصرے اور دیباچے لکھ کر گویا اردو کے معروف نقادوں کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کیا ہے۔ اپنے اس دعوے کو دلیل فراہم کرنے کی غرض سے جب میں نے نعت ریسرچ سینٹر میں موجود نعتیہ سرمائے پر اک سرسری سی نظر ڈالی تو مجھے کشفی صاحب کے نعت پر لکھے گئے مختلف مضامین، آرا اور فلیپ کے درج ذیل حوالے مل گئے اور اس طرح یہ مختصر مگر کارآمد فہرست سامنے آ گئی۔

مختلف کتابوں میں لکھے گئے دیباچے اور پیش لفظ

شمار	مضمون	کتاب	مصنف	سنِ اشاعت	ناشر
۱۔	اسماء الٰہیہ کا آئینہ خانہ	صحیفہ حمد	لطیف اثر	۱۹۸۸ء	وقاص اکیڈمی، کراچی
۲۔	حروفِ محبت	اللّٰھم	لطیف اثر	۱۹۹۶ء	وقاص اکیڈمی، کراچی
۳۔	فیضانِ رسول	حمد و نعت	ع س مسلم	۱۹۸۹ء	مقبول اکیڈمی، لاہور
۴۔	پیش لفظ	اساس	سرشار صدیقی	۱۹۹۰ء	اثاثہ، کوئٹہ
۵۔	حرفِ اوّل	پہلی کرن آخری روشنی	اعجاز رحمانی	۱۹۸۲ء	مصنف، کراچی
۶۔	بشارت	طلوعِ حمد	لطیف اثر	۲۰۰۰ء	جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی
۷۔	صاحبِ بصیرت نعت گو	نظر نظر طیبہ	شعیب آبرو فیض آبادی	۱۹۹۳ء	بزمِ حمد و نعت، کراچی
۸۔	جوئے نور کی ایک سوچ	محبوب	صوفی جاوید اقبال معصومی	۱۹۹۷ء	انجمن دبستانِ بولان، کراچی
۹۔	تلاش جلوۂ حرف سپاس	تقدیس	تابش دہلوی	۱۹۸۵ء	ادب گاہ، کراچی
۱۰۔	سرکار کی چاہت والا	ارمغانِ جمیل	جمیل نقوی	۱۴۰۵ھ	الیٹ پبلشرز، لمیٹڈ، کراچی
۱۱۔	اثباتِ حیات	سرکار	اختر لکھنوی	۱۹۹۵ء	قلم نشانِ پاکستان، کراچی
۱۲۔	پیش لفظ	ندائے نوری	مسرت جہاں نوری	سن ندارد	مصنفہ، کراچی
۱۳۔	شاہد الوریٰ کا ایک اور مبارک سفر	حمد و ثنا	شاہد الوریٰ	۱۹۸۴ء	مکتبہ الانصار، کراچی
۱۴۔	پیش لفظ	بصیرت	نعیم تقوی	۱۹۷۸ء	مجلسِ افکارِ اسلامی، کراچی
۱۵۔	رسالت مآب اور اقبال صفی پوری	رحمت لقب	اقبال صفی پوری	۱۹۸۸ء	مرکزِ نعت، کراچی
۱۶۔	افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری	طور سے حرا تک	افسر ماہ پوری	۱۹۹۶ء	افسر ماہ پوری، میموریل سوسائٹی، کراچی
۱۷۔	دل کی شاعری	کہف الوریٰ	قمر وارثی	۱۹۹۵ء	دبستانِ وارثیہ، کراچی
۱۸۔	پیش لفظ	سفینۂ نعت	مسرور کیفی	۱۹۹۰ء	ادارہ فروغ ادب، کراچی
۱۹۔	اسوۂ احمد مختار اور حافظ کی نعت گوئی	ارمغانِ حافظ	حفاظ عبدالغفار حافظ	۱۹۸۵ء	بزمِ رضا، کراچی
۲۰۔	نعت کے نئے اُفق	حرف حرف خوشبو	وقار صدیقی اجمیری	۱۹۹۸ء	فرید پبلشرز، کراچی
۲۱۔	رفعنا لک ذکرک	مدحت خیر البشر	راغب مراد آبادی	۱۹۷۹ء	سفینہ اکیڈمی، کراچی
۲۲۔	پیش لفظ	چراغِ حرا	مسرور کیفی	۱۹۷۸ء	عروجِ ادب، کراچی
۲۳۔	ایک جامع اور نمائندہ حمدیہ انتخاب	خزینۂ حمد	طاہر سلطانی	۱۹۹۶ء	ادارہ چمنستانِ حمد و نعت، کراچی
۲۴۔	نزول پہ ایک نظر	نزول	شفیق الدین شارق	۱۹۹۹ء	اقلیمِ نعت، کراچی

۲۵۔ ایک خوش نوا فقیر	آنکھ بنی کشکول	آفتاب کریمی	۱۹۹۷ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۲۶۔ جادۂ رحمت کا مسافر	جادۂ رحمت	صبیح رحمانی	۱۹۹۳ء	ممتاز پبلشرز، کراچی
۲۷۔ قصری نے نعتیہ قصیدے کو نقشِ جلیل بنا دیا ہے	نورِ ازل	قصری کان پوری	۱۹۸۰ء	مکتبہ قصری کان پوری، کراچی
۲۸۔ پیش لفظ	ثنائے حبیب	پیامی مراد آبادی	۱۹۸۳ء	مصنف، کراچی
۲۹۔ بہر زماں بہر زباں	تعارفی مجلّہ	نور احمد میرٹھی	---	ادارۂ فکرِ نو، کراچی
عطائے ادب	بہر زماں بہر زباں			
۳۰۔ تلوار کی دھار پر چلنے والا نعت گو	بعد از خدا	پیامی مراد آبادی	۱۹۹۴ء	مصنف، کراچی
۳۱۔ غلام صاحب طیبہ	نور و نکہت	شاعر لکھنوی	۲۰۰۰ء	جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی
۳۲۔ تعارف	لگا ہے یا رسول اللہ لگا ہے	نثار احمد خاں فتحی	۱۹۹۲ء	مکتبہ اہلِ سنت و جماعت، کراچی
۳۳۔ صحیفہ اسمائے مبارک نبویؐ	صحیفہ نعت	لطیف اثر	۱۹۸۹	کان پور اکیڈمی، کراچی
۳۴۔ مقبول نقش کا نقشِ عقیدت	حرفِ ثبات	مقبول نقش	۲۰۰۴ء	ہم سخن رائٹرز فورم، کراچی
۳۵۔ پیش لفظ	اردو میں حمد و مناجات	ڈاکٹر یحییٰ نشیط	۲۰۰۰ء	فضلی سنز، کراچی
۳۶۔ ہیں مواجہ پہ ہم (ایک تاثر)	جادۂ رحمت کا مسافر	ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی	۲۰۰۱ء	آفتاب اکیڈمی، کراچی
۳۷۔ ایک قادر الکلام شاعر	زادِ آخرت	جامع بدایونی	۱۹۹۱ء	توصیف پرنٹرز، کراچی
۳۸۔ فرازِ شوق کا شاعر	خوشبوئے دوست	ستار وارثی	۲۰۰۳ء	بزمِ وارث، کراچی
۳۹۔ کیف نعت و سلام	خلق مجسم	سیّد محمد حنیف اخگر	۲۰۰۳ء	دبستانِ وارثیہ، کراچی
۴۰۔ ایک شاعرانہ انجیل	روشنی کے خدوخال	رفیع الدین راز	۲۰۰۵ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۴۱۔ لاریب	لاریب	اقبال حیدر	۲۰۰۶ء	ادارہ تعمیر ادب، کراچی
۴۲۔ پیش لفظ	میثاق	سرشار صدیقی	۲۰۰۲ء	حرا فاؤنڈیشن، کراچی
۴۳۔ کشتی عشق کا ساحل طیبہ	فانوس ہفت رنگ	رشیدہ عیاں	۲۰۰۴ء	زین پبلی کیشنز، کراچی
۴۴۔ پیش گفتار	نسبت	ابوالخیر کشفی	۱۹۹۱ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۴۵۔ مضمون	جمالِ حرم	مسرور کیفی	۱۹۸۱ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۴۶۔ پیش لفظ	عقیدت	افتخار اجمل شاہین	۲۰۰۴ء	بزمِ شادانی، کراچی
۴۷۔ تاثرات	محرابِ عقیدت	امین راحت چغتائی	۲۰۰۷ء	بک سینٹر، راولپنڈی

۴۸۔ ہشام علی حافظ

۲۵۔	ایک خوش نوا فقیر	آنکھ بنی کشکول	آفتاب کریمی	۱۹۹۷ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۲۶۔	جادۂ رحمت کا مسافر	جادۂ رحمت	صبیح رحمانی	۱۹۹۳ء	ممتاز پبلشرز، کراچی
۲۷۔	قصری نے نعتیہ قصیدے کو نقش جلیل بنا دیا ہے	نورِ ازل	قصری کان پوری	۱۹۸۰ء	مکتبہ قصری کان پوری، کراچی
۲۸۔	پیش لفظ	ثنائے حبیب	پیامی مرادآبادی	۱۹۸۳ء	مصنف، کراچی
۲۹۔	بہرزماں بہرزباں	تعارفی مجلّہ	نور احمد میرٹھی	---	ادارۂ فکرِ نو، کراچی
	عطائے ادب	بہرزماں بہرزباں			
۳۰۔	تلوار کی دھار پر چلنے والا نعت گو	بعد از خدا	پیامی مرادآبادی	۱۹۹۴ء	مصنف، کراچی
۳۱۔	غلام صاحب طیبہ	نور و نکہت	شاعر لکھنوی	۲۰۰۰ء	جہانِ حمد پبلی کیشنز، کراچی
۳۲۔	تعارف	نگاہے یارسول اللہ نگاہے،	نثار احمد خاں فتحی	۱۹۹۲ء	مکتبہ اہلِ سنت و جماعت، کراچی
۳۳۔	صحیفہ اسمائے مبارک نبویؐ	صحیفہ نعت	لطیف اثر	۱۹۸۹ء	کان پور اکیڈمی، کراچی
۳۴۔	مقبول نقش کا نقشِ عقیدت	حرفِ ثبات	مقبول نقش	۲۰۰۴ء	ہم سخن رائٹرز فورم، کراچی
۳۵۔	پیش لفظ	اردو میں حمد و مناجات	ڈاکٹر یحییٰ نشیط	۲۰۰۰ء	فضلی سنز، کراچی
۳۶۔	ہیں مواجہ پہ ہم (ایک تاثر)	جادۂ رحمت کا مسافر	ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی	۲۰۰۱ء	آفتاب اکیڈمی، کراچی
۳۷۔	ایک قادر الکلام شاعر	زادِ آخرت	جامع بدایونی	۱۹۹۱ء	توصیف پرنٹرز، کراچی
۳۸۔	فرازِ شوق کا شاعر	خوشبوئے دوست	ستار وارثی	۲۰۰۳ء	بزمِ وارث، کراچی
۳۹۔	کیف نعت و سلام	خلق مجسم	سیّد محمد حنیف اخگر	۲۰۰۳ء	دبستانِ وارثیہ، کراچی
۴۰۔	ایک شاعرانہ انجیل	روشنی کے خدوخال	رفیع الدین راز	۲۰۰۵ء	میڈیا گرافکس، کراچی
۴۱۔	لاریب	لاریب	اقبال حیدر	۲۰۰۶ء	ادارہ تعمیر ادب، کراچی
۴۲۔	پیش لفظ	میثاق	سرشار صدیقی	۲۰۰۲ء	حرا فاؤنڈیشن، کراچی
۴۳۔	کشتی عشق کا ساحل طیبہ	فانوس ہفت رنگ	رشیدہ عیاں	۲۰۰۴ء	زین پبلی کیشنز، کراچی
۴۴۔	پیش گفتار	نسبت	ابوالخیر کشفی	۱۹۹۱ء	اقلیم نعت، کراچی
۴۵۔	مضمون	جمالِ حرم	مسرور کیفی	۱۹۸۱ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۴۶۔	پیش لفظ	عقیدت	افتخار اجمل شاہین	۲۰۰۴ء	بزمِ شادانی، کراچی
۴۷۔	تاثرات	محرابِ عقیدت	امین راحت چغتائی	۲۰۰۷ء	بک سینٹر، راولپنڈی
۴۸۔	ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری	محبوب آقا	ہشام علی حافظ	۱۹۹۹ء	فضلی سنز، کراچی
۴۹۔	نعت حضوری کا ایک وسیلہ	انوار حرمین	صدیق اسماعیل	۱۹۸۵ء	گیلانی پبلی کیشنز، کراچی
۵۰۔	پیش لفظ	التجا	حسن اکبر کمال	۲۰۰۲ء	سیپ پبلی کیشنز، کراچی
۵۱۔	مضمون	انتخابِ نعت (جلد دوم)	عبدالغفور قمر	۱۹۹۷ء	الخیر کارپوریشن، لاہور
۵۲۔	نعت کی دنیا کا شہری انتخاب	انتخابِ نعت (جلددوم)	عبدالغفور قمر	۱۹۹۸ء	زاہد بشیر انٹرپرائزز، لاہور

رسائل و جرائد میں شائع شدہ مضامین

شمار	مضمون	سنِ اشاعت	رسائل و جرائد
۵۱۔	ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری	۱۹۹۶ء	نعت رنگ، شمارہ:۲
۵۲۔	اردو نعت کا مستقبل (ریڈیائی فیچر)	۱۹۹۶ء	نعت رنگ، شمارہ:۳
۵۳۔	نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم	۱۹۹۷ء	نعت رنگ، شمارہ:۴
۵۴۔	نعت گوئی کے عناصر	۱۹۹۸ء	نعت رنگ، شمارہ:۵
۵۵۔	نعت کے موضوعات	۱۹۹۸ء	نعت رنگ، شمارہ:۶
۵۶۔	غزل میں نعت کی جلوہ گری	۲۰۰۰ء	نعت رنگ، شمارہ:۹
۵۷۔	امین راحت چغتائی کی نعت گوئی	۲۰۰۰ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۰
۵۸۔	دو نعتیہ نظمیں (تجزیہ)	۲۰۰۱ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۱
۵۹۔	عہدِ رسالت مآبؐ کی محافل کا عمرانی مطالعہ	۱۹۹۱ء	مجلّہ حضرت حسان نعت ایوارڈ
۶۰۔	فارسی اور اردو میں نعت کی روایت	۱۹۹۲ء	مجلّہ حضرت حسان نعت ایوارڈ
۶۱۔	نعت گوئی اور نعت کی محافل کا عمرانی مطالعہ	۲۰۰۱ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۲
۶۲۔	صحنِ مسجدِ نبویؐ کی ایک تحریر	۲۰۰۱ء	سفیرِ نعت (صبیح رحمانی نمبر)
۶۳۔	شیبا حیدری کا حمد نامہ یا شعور کا دریا	۲۶/اپریل ۲۰۰۰ء	روزنامہ نوائے وقت، ادبی ایڈیشن
۶۴۔	نعت کے جگنوؤں کے تعاقب میں (حصہ اوّل)	۲۰۰۴ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۶
۶۵۔	نعت کے جگنوؤں کے تعاقب میں (حصہ دوم)	۲۰۰۴ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۷
۶۶۔	سلام رضا کے دو باغوں کی سیر	۲۰۰۵ء	نعت رنگ، شمارہ:۱۸
۶۷۔	عزیز احسن کا شعرِ عقیدت	۲۰۰۸ء	نعت رنگ، شمارہ:۲۰

فلیپ/ رائے/ تاثرات

شمار	کتاب	مرتب/مصنف	سنِ اشاعت	ناشر
۶۸۔	حضوری	عاطف معین قاسمی	۲۰۰۱ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۶۹۔	خوابوں میں سنہری جالی ہے	عزیز احسن	۱۹۹۷ء	فضلی سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی
۷۰۔	مرے آقا	اُمید فاضلی	۱۹۸۴ء	سیپ پبلی کیشنز، کراچی
۷۱۔	حریم نعت	رئیس احمد	۱۹۹۵ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۷۲۔	و رفعنا لک ذکرک	ابرار کرت پوری	۱۹۸۷ء	مرکزِ علم دانش، نئی دہلی
۷۳۔	حرفِ عطا	مسرور کیفی	۱۹۹۶ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۷۴۔	منتخب سلام	ماجد صدیقی، والی آسی	ندارد	مجلسِ نشریات، اسلام
۷۵۔	صحیفۂ حمد	لطیف اثر	۱۹۸۸ء	وقاص اکیڈمی، کراچی
۷۶۔	سبز گنبد نیلا آسمان	احمد فاخر	۱۹۹۲ء	انجمن سخن ورانِ پاکستان، کراچی
۷۷۔	نعت رنگ کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ	شفقت رضوی	۲۰۰۴ء	مہرِ منیر اکیڈمی انٹرنیشنل، کراچی
۷۸۔	نعت کی تخلیقی سچائیاں	عزیز احسن	۲۰۰۳ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۷۹۔	چراغِ تجلّی (انتخاب) محسن کاکوروی	سیّد محمد ابوالخیر کشفی	۱۹۹۴ء	بزمِ حمد و نعت، کراچی
۸۰۔	نقشِ سعادت (انتخاب)	سیّد محمد ابوالخیر کشفی	۱۹۶۶ء	طاہرہ کتاب گھر، کراچی
۸۱۔	آرزو	عبدالمالک مضطر	۲۰۰۳ء	عبدالمالک مضطر، کراچی
۸۲۔	نعت اور آدابِ نعت	علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی	۲۰۰۳ء	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
۸۳۔	حضوری چاہتی ہوں	پروین جاوید	ندارد	اربابِ ادب، کراچی
۸۴۔	رحمتِ تمام	بزمِ ادب	۱۹۸۸ء	نیشنل بینک آف پاکستان
۸۵۔	سرکار کے قدموں میں	صبیح رحمانی	۲۰۰۶ء	دعا پبلی کیشنز، لاہور
۸۶۔	قوسین	آفتاب کریمی	۲۰۰۵ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۸۷۔	حرفِ عطا	مسرور کیفی	۱۹۹۲ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۸۸۔	سجدہ حرف	مسرور کیفی	۱۹۹۸ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۸۹۔	مولائے کل	مسرور کیفی	۱۹۸۲ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۹۰۔	مرشد جبریل	محمد اسحاق آشفتہ	۲۰۰۷ء	ندارد
۹۱۔	ہنر نازک ہے	عزیز احسن	۲۰۰۷ء	اقلیمِ نعت، کراچی

مجھے یقین ہے کہ نعت کے موضوع پر لکھے گئے ان مضامین و آرا کی یہ فہرست حتمی نہیں ہے۔ مستقبل میں کسی نہ کسی کو اس موضوع کو وسعت دیتے ہوئے کشفی صاحب کی نعت شناسی پر کوئی جامع تحقیقی کام کرنا ہوگا تا کہ نعت کے موضوع پر یہ اور ایسے مزید جواہر پارے یک جا ہوسکیں اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کا

شمار	کتاب	مرتب/مصنف	سنِ اشاعت	ناشر
۶۸۔	حضوری	عاطف معین قاسمی	۲۰۰۱ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۶۹۔	خوابوں میں سنہری جالی ہے	عزیز احسن	۱۹۹۷ء	فضلی سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، کراچی
۷۰۔	مرے آقا	اُمید فاضلی	۱۹۸۴ء	سیپ پبلی کیشنز، کراچی
۷۱۔	حریمِ نعت	رئیس احمد	۱۹۹۵ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۷۲۔	ورفعنا لک ذکرک	ابرار کرت پوری	۱۹۸۷ء	مرکزِ علم دانش، نئی دہلی
۷۳۔	حرفِ عطا	مسرور کیفی	۱۹۹۶ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۷۴۔	منتخب سلام	ماجد صدیقی، والی آسی	ندارد	مجلسِ نشریات، اسلام
۷۵۔	صحیفۂ حمد	لطیف اثر	۱۹۸۸ء	وقاص اکیڈمی، کراچی
۷۶۔	سبز گنبد نیلا آسمان	احمد فاخر	۱۹۹۲ء	انجمن سخن ورانِ پاکستان، کراچی
۷۷۔	نعت رنگ کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ	شفقت رضوی	۲۰۰۴ء	مہرِ منیر اکیڈمی انٹرنیشنل، کراچی
۷۸۔	نعت کی تخلیقی سچائیاں	عزیز احسن	۲۰۰۳ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۷۹۔	چراغِ تجلّی (انتخاب) محسن کاکوروی	سیّد محمد ابوالخیر کشفی	۱۹۹۴ء	بزمِ حمد و نعت، کراچی
۸۰۔	نقشِ سعادت (انتخاب)	سیّد محمد ابوالخیر کشفی	۱۹۶۶ء	طاہرہ کتاب گھر، کراچی
۸۱۔	آرزو	عبدالمالک مضطر	۲۰۰۳ء	عبدالمالک مضطر، کراچی
۸۲۔	نعت اور آدابِ نعت	علامہ کوکب نورانی اوکاڑوی	۲۰۰۳ء	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
۸۳۔	حضوری چاہتی ہوں	پروین جاوید	ندارد	اربابِ ادب، کراچی
۸۴۔	رحمتِ تمام	بزمِ ادب	۱۹۸۸ء	نیشنل بینک آف پاکستان
۸۵۔	سرکار کے قدموں میں	صبیح رحمانی	۲۰۰۶ء	دعا پبلی کیشنز، لاہور
۸۶۔	قوسین	آفتاب کریمی	۲۰۰۵ء	اقلیمِ نعت، کراچی
۸۷۔	حرفِ عطا	مسرور کیفی	۱۹۹۲ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۸۸۔	سجدہ حرف	مسرور کیفی	۱۹۹۸ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۸۹۔	مولائے کل	مسرور کیفی	۱۹۸۲ء	ادارہ فروغِ ادب، کراچی
۹۰۔	مرشد جبریل	محمد اسحاق آشفتہ	۲۰۰۷ء	ندارد
۹۱۔	ہنر نازک ہے	عزیز احسن	۲۰۰۷ء	اقلیمِ نعت، کراچی

مجھے یقین ہے کہ نعت کے موضوع پر لکھے گئے ان مضامین و آرا کی یہ فہرست حتمی نہیں ہے۔ مستقبل میں کسی نہ کسی کو اس موضوع کو وسعت دیتے ہوئے کشفی صاحب کی نعت شناسی پر کوئی جامع تحقیقی کام کرنا ہوگا تا کہ نعت کے موضوع پر یہ اور ایسے مزید جواہر پارے یک جا ہوسکیں اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کا بغور جائزہ لیا جاسکے۔ لیکن ایک بات طے ہے کہ اس فہرست کو دیکھ کر ہمیں یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ کشفی صاحب نے ادب کے دیگر موضوعات پر لکھتے ہوئے اور بہت کچھ لکھتے ہوئے نعت کو ہمیشہ اپنی ترجیحات میں شامل رکھا۔ یہی نہیں بلکہ اس فہرست میں شامل تاریخ اشاعت کے حوالے سے یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ انھوں نے اس زمانے میں بھی نعت پر پوری سنجیدگی، متانت اور ادبیت کے ساتھ لکھا جب نعت جیسے موضوعات پر لکھنا اپنی ادبی ساکھ کو داؤ پر لگانے کے مترادف تھا۔

شاعری کی تحسین کے لیے یوں تو سخن فہمی ہی کافی ہے لیکن اگر کوئی نقاد تخلیقی تجربے سے بھی گزرا ہو تو شعری محاسن اور ادبی بنت کی بہتر داد دے سکتا ہے۔ ایسے نقاد کی رائے گم راہ کن نہیں ہوسکتی۔ اس حوالے سے بھی کشفی صاحب کو اختصاص حاصل تھا کہ آپ نے نہ صرف نعت کی تحسین کے لیے تربیت کے حامل تھے بلکہ خود بھی تخلیقی کرب کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ آپ کے مجموعہ نعت 'نسبت' کی شاعری کمیت کے اعتبار سے کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو معیار یا کیفیت کے افق پر تابندہ ستارے کے مانند ہے۔

اب کہ جب نعت کا پھریرا ہر چہار سمت اُڑ رہا ہے، اس مقدس صنف کی طرف وہ شعرا بھی مائل نظر آتے ہیں جو اس سے قبل نام نہاد ترقی پسندی کے دامِ فریب کا شکار تھے اور حمد و نعت کی شاعری کو شاعری ماننے کو بھی تیار نہیں تھے۔ تاہم یہ ایک اچھا شگون ہے کہ صبح کے بھولے شام کو گھر آگئے۔ تخلیقِ نعت کا چرچا تو عام ہوا لیکن نعت میں ادب شناسی، موضوع کی نزاکتوں کی تفہیم اور شعری جمالیات یا شعریات (Poetics) کی سمت نمائی کا عمل ''نعت رنگ'' کے اجرا سے قبل اس سرعت سے آگے نہیں بڑھ سکا تھا۔ کشفی صاحب نے نقدِ نعت کی اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جب کہ ادب کے بہت سے سکہ بند نقاد تحسینِ نعت کے عمل میں شامل ہی نہیں ہوسکے۔

کشفی صاحب ''نعت رنگ'' کی سرپرستی کی اور اس کا حق ادا کیا۔ کئی کڑے مرحلے آئے مگر انھوں نے خندہ پیشانی کے ساتھ صرف موضوع کی رفعتوں پر نظر رکھی اور لکھتے رہے۔ پوری ادبی دنیا میں شاید ہی کوئی اور شخصیت ہو جو ''نعت رنگ'' کا اس طرح انتظار کرتی ہو جس طرح وہ کرتے تھے۔

پیشِ نظر کتاب ''تخلیق و تنقیدِ نعت اور ڈاکٹر ابوالخیر کشفی'' میں چند تاثراتی مضامین شامل ہیں جو ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی تنقیدی بصیرت اور تخلیقی دانش کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے جمع کیے گئے

ہیں۔ ان میں سے بیش تر مضامین معاصر رسائل و جرائد میں لکھے گئے تھے... تاثراتی تنقید کو یار لوگوں نے غیر اہم بنانے کی بڑی کوششیں کی ہیں اس لیے عرض کردوں کہ ادب شناس طبقے کا تاثر بھی رواروی کا تاثر نہیں ہوتا ہے اس تاثر کے پسِ پردہ پوری ادبی شخصیت ہوتی ہے جس کا علمی و ادبی شعور تاثر کو قرطاس پر بکھیرنے میں پوری طرح صرف ہوتا ہے۔ تاثراتی تنقید نری ذاتی رائے نہیں ہوتی ہے بلکہ منجھے ہوئے ذوق، باریک بینی، نکتہ شناسی، تخلیقی دانش، لسانیاتی آگہی اور فکری غواصی کا مظہر ہوتی ہے۔ کشفی صاحب نے زندگی بھر تاثراتی تنقیدی نہج کو سینے سے لگائے رکھا ہے اور بڑے خلوص سے اسے نعتیہ ادب کی تحسین کے لیے وقف فرمایا ہے اسی لیے ان کی تحریروں سے ادبی حظ اٹھانے اور علمی استفادہ کرنے والوں نے ان کی نثر و نظم پر اپنے راست تاثرات حوالہ قرطاس کیے ہیں اور صرف مداحی نہیں کی بلکہ کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ مضامین پروفیسر محمد اقبال جاوید، پروفیسر اکرم رضا، پروفیسر شفقت رضوی، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ اور عزیز احسن کے لکھے ہوئے ہیں۔

ان مضامین سے کشفی صاحب کے ادبی قامت اور نعت سے قلبی تعلق کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہو جاتا ہے لیکن سچی بات ہے کہ یہ مضامین ڈاکٹر صاحب موصوف کی ادبی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کرتے۔ کشفی صاحب کے ادبی شعور، تنقیدی اور تخلیقی اسلوب کے جمال کی نقاب کشائی اور ان کی تنقیدی و تخلیقی دانش کی قدر و قیمت کا تعین بہرحال راسخ العقیدہ ادب شناسوں اور نعت کے خدمت گزاروں پر قرض ہے۔ اس کے باوجود میں عرض کروں گا کہ آئی ٹی کے غوغا، تجارتی سرگرمیوں کے شور، بے دینی کی چلتی ہوئی بادِ سموم اور ادب بیزاری کے اس عہد میں یہ چند مضامین بھی کم از کم ادب کے دینی پہلو کی سمت نمائی تو کرتے ہیں۔ ہمارا عہد زندگی کی مقصدیت اور اعلیٰ اقدار کی عدم موجودگی کا احساس دلانے والے ''افراد'' سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ کشفی صاحب نے ادب کے تقاضوں کو نظرانداز کیے بغیر یہ فریضہ انجام دیا ہے، لہٰذا ایک مردِ درویش کے لیے لکھے جانے والے یہ تھوڑے سے مضامین شاید ملت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی سعی کے طور پر قبول کر لیے جائیں! خاتم الانبیا نبی مکرم ﷺ کا حسنِ صوری و معنوی اپنے لفظوں میں سمونے والوں کا قلم بہ قول علامہ سیّد سلیمان ندوی ''عصائے موسویؑ کی صفت کا حامل ہوتا ہے اور جس کاغذ پر یہ ذکرِ جمیل رقم ہوتا ہے اس کاغذ کو یدِ بیضا کا نور عطا کیا جاتا ہے۔

ہیں۔ ان میں سے بیش تر مضامین معاصر رسائل و جرائد میں لکھے گئے تھے... تاثراتی تنقید کو یار لوگوں نے غیر اہم بنانے کی بڑی کوششیں کی ہیں اس لیے عرض کر دوں کہ ادب شناس طبقے کا تاثر بھی روا روی کا تاثر نہیں ہوتا ہے اس تاثر کے پسِ پردہ پوری ادبی شخصیت ہوتی ہے جس کا علمی و ادبی شعور تاثر کو قرطاس پر بکھیرنے میں پوری طرح صرف ہوتا ہے۔ تاثراتی تنقید نری ذاتی رائے نہیں ہوتی ہے بلکہ منجھے ہوئے ذوق، باریک بینی، نکتہ شناسی، تخلیقی دانش، لسانیاتی آگہی اور فکری غواصی کا مظہر ہوتی ہے۔ کشفی صاحب نے زندگی بھر تاثراتی تنقیدی نہج کو سینے سے لگائے رکھا ہے اور بڑے خلوص سے اسے نعتیہ ادب کی تحسین کے لیے وقف فرمایا ہے اسی لیے ان کی تحریروں سے ادبی حظ اٹھانے اور علمی استفادہ کرنے والوں نے ان کی نثر و نظم پر اپنے راست تاثرات حوالہ قرطاس کیے ہیں اور صرف مداحی نہیں کی بلکہ کہیں کہیں اختلاف بھی کیا ہے۔ یہ مضامین پروفیسر محمد اقبال جاوید، پروفیسر اکرم رضا، پروفیسر شفقت رضوی، ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی، ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ اور عزیز احسن کے لکھے ہوئے ہیں۔

ان مضامین سے کشفی صاحب کے ادبی قامت اور نعت سے قلبی تعلق کا تھوڑا بہت اندازہ تو ہوجاتا ہے لیکن سچی بات ہے کہ یہ مضامین ڈاکٹر صاحب موصوف کی ادبی شخصیت کا مکمل احاطہ نہیں کرتے۔ کشفی صاحب کے ادبی شعور، تنقیدی اور تخلیقی اسلوب کے جمال کی نقاب کشائی اور ان کی تنقیدی و تخلیقی دانش کی قدر و قیمت کا تعین بہرحال راسخ العقیدہ ادب شناسوں اور نعت کے خدمت گزاروں پر قرض ہے۔ اس کے باوجود میں عرض کروں گا کہ آئی ٹی کے غوغا، تجارتی سرگرمیوں کے شور، بے دینی کی چلتی ہوئی بادِ سموم اور ادب بیزاری کے اس عہد میں یہ چند مضامین بھی کم از کم ادب کے دینی پہلو کی سمت نمائی تو کرتے ہیں۔

ہمارا عہد زندگی کی مقصدیت اور اعلیٰ اقدار کی عدم موجودگی کا احساس دلانے والے ''افراد'' سے خالی ہوتا جا رہا ہے۔ کشفی صاحب نے ادب کے تقاضوں کو نظر انداز کیے بغیر یہ فریضہ انجام دیا ہے، لہٰذا ایک مردِ درویش کے لیے لکھے جانے والے یہ تھوڑے سے مضامین شاید ملت کی طرف سے فرضِ کفایہ ادا کرنے کی سعی کے طور پر قبول کر لیے جائیں! خاتم الانبیا نبی مکرم ﷺ کا حسنِ صوری و معنوی اپنے لفظوں میں سمونے والوں کا قلم بہ قول علامہ سیّد سلیمان ندوی ''عصائے موسویؑ کی صفت کا حامل ہوتا ہے اور جس کاغذ پر یہ ذکرِ جمیل رقم ہوتا ہے اس کاغذ کو یدِ بیضا کا نور عطا کیا جاتا ہے۔

کشفی صاحب اس حقیقت سے آشنا تھے اسی لیے وہ ساری عمر اپنے پُر بہار قلم سے سینۂ قرطاس پر ایسی نوری تحریریں لکھتے رہے۔

وہ نعت نگر کے باسی تھے ان کے شب و روز ذکرِ نبی کریم ﷺ اور یادِ نبی کریم ﷺ کی پاکیزہ فضاؤں میں گزرتے تھے یہی وجہ ہے کہ قرآنیات، سیرت اور نعت ہی نہیں ادب کے دیگر موضوعات پر لکھتے ہوئے بھی حبِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی آپ کی تحریروں میں بہت واضح نظر آتی ہے۔ ان کی تحریر کا ہر لفظ چراغ کی طرح لَو دیتا ہے اور اس لَو میں ایک جہانِ معانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

نعت کو تجلّیِ مسلسل کہنے والے کشفی صاحب کا نظریہ نعت دیکھیے مجھے یقین ہے یہ مختصر سی مثال آپ کے ذہن و روح کو منور کرنے کے لیے کافی ہوگی۔

> نعت گوئی اپنی جان کی قیمت پر سروَرِ دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے...ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دُور ہے۔
>
> نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ انؐ کی خدمت عالیہ میں حاضری کا نام ہے...شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف وصورت کی دنیا میں کبھی مل جائے۔
>
> نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں۔
>
> نعت گوئی اس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم معلوم نہیں۔ رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار۔
>
> نعت دل زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے۔
>
> نگاہے یا رسول نگاہے

(''نسبت''، صفحہ نمبر ۷)

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے قلبی، روحانی اور قلمی ربط رکھنے کے شوق میں گلشنِ نعت کی مسلسل آب یاری کرتے رہنے کی سعادت پانے والے ڈاکٹر کشفی کے اس عملِ خیر کو بہ نگاہِ پسندیدگی دیکھنے والوں کے ان مضامین میں آپ کو عشق کے ایسے کئی اور جہاں آباد نظر آئیں گے۔

اللہ کرے کشفی صاحب کے دل کا گداز، ان کی تحریروں کا حسن اور ان کے اظہار میں عشقِ نبوی کی تڑپ محسوس کرنے والے لکھاریوں اور اُن کے قارئین کو بھی اجر میں قربِ نبوی ﷺ نصیب ہو جائے (آمین)

اللہ کرے کشفی صاحب کے دل کا گداز، ان کی تحریروں کا حسن اور ان کے اظہار میں عشقِ نبوی کی تڑپ محسوس کرنے والے لکھاریوں اور اُن کے قارئین کو بھی اجر میں قربِ نبوی ﷺ نصیب ہوجائے (آمین)

پروفیسر محمد اقبال جاوید

نعت اور آدابِ نعت گوئی

افاداتِ کشفی کی روشنی میں

جناب سیّد محمد ابوالخیر کشفی سے احقر ذاتی طور پر شناسا نہیں ہے۔ نام ضرور سن رکھا تھا مگر ان کی تحریروں سے تعارف ''نعت رنگ'' کی وساطت سے ہوا، جوں جوں انھیں پڑھتا گیا، توں توں روحانی طور پر ان کے قریب ہوتا چلا گیا اور ظاہری شناسائی بے معنی سی ہو کر رہ گئی کہ:

تصور خود بنا لیتا ہے 'تحریروں' سے تصویریں
مری محفل میں نادیدہ بھی نادیدہ نہیں ہوتے

ان کی 'نعت شناسی' سے متعلق یہ طویل مضمون ازخود چار حصوں میں بٹ گیا ہے۔

(الف) جناب کشفی کی تحریر کے آئینے میں ان کی اپنی شخصیت کے خال و خط ہیں کہ تحریر پر لکھنے والی شخصیت کی چھوٹ تو بہرکیف پڑا کرتی ہے:

(ب) ان کی عقیدت، رسالت مآب ﷺ کی عظیم و جلیل شخصیت کا کس انداز سے طواف کرتی ہے؟

(ج) ان کے نقطۂ نظر سے 'نعت' کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟

(د) آدابِ نعت گوئی کے بارے میں ان کے نظریات کیا ہیں؟

گو حوالے ساتھ ساتھ موجود ہیں مگر ان کے اقتباسات، احقر کی تحریر کے تسلسل میں ضم ہوگئے ہیں:

تا کس نگوید بعدازیں من دیگرم تو دیگری

گویا زیرِ نظر سطور میں پروفیسر محمد ابوالخیر کشفی کی تحریروں میں بکھرے موتیوں کو ایک انشائی ربط کے ساتھ یک جا کرنے کی امکانی سعی کی گئی ہے۔

(محمد اقبال جاوید)

جناب سیّد محمد ابوالخیر کشفی جیسی خود شناس اور خدا آگاہ شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں، ان کے لیے گردش لیل و نہار کو مدتوں منتظر رہنا پڑتا ہے۔ اس دور فتنۂ آخر زماں میں دل و نگاہ، آگہی کے اسی کیف کے لیے ترس رہے ہیں۔ یہ دن یادوں سے معطر ہیں نہ راتیں اشکوں سے منور، نہ چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ، گل ہیں کہ سرشاخ جل گئے ہیں اور دل ہیں کہ سرشام بجھ گئے ہیں... کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، ساری دنیا ہماری حالت پر ہنس رہی ہے مگر ہمیں اپنی حالت پر رونا نہیں آتا:

ہم وہ تھے جن کو خندۂ گل نے جگا دیا
ہم وہ ہیں جو خروش سلاسل میں سو گئے

ایسے میں اگر کوئی شخصیت ایسی ہے جس کے دل میں ایمان کی حلاوت، روح میں خشیتِ الٰہی کی جھلک، آنکھ میں حیا کی معصومیت اور تحریر میں عدل و خیر کی تعبیر ہے تو جہاں اس نعمت کے لیے بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز استحسان ہوں وہاں اس شخصیت کے لیے بھی اپنے دل کی دعائیں اور قلم کی نوائیں وقف کر دینا اپنا فرض انسانیت جانتا ہوں، ایسے خوش نصیب خال خال ہیں جو التجاؤں کے جلو قلم اٹھاتے، حرف حرف اجالتے، لفظ لفظ نکھارتے، خود نعت کہتے اور دوسروں کی لکھی ہوئی نعتیں پڑھتے پڑھتے دیار شب سے سواد فجر تک پہنچ جاتے ہیں تو بے ساختہ اپنی کیفیت کا اظہار یوں کر جاتے ہیں... ''لیجیے فجر کی پہلی اذان فضا میں بلند ہو رہی ہے، مؤذن اللہ تعالیٰ کی وحدت اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور اب وہ کہنے ہی والا ہے کہ الصلوٰۃ خیر من النوم۔ اذان فجر کے بارے میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

آج رات آپ کی شاعری نے مجھے غفلت سے دور رکھا اور میں آپ کے دل کی دھڑکنیں سنتا رہا اور میں نے اپنے آپ کو روحانی طور پر ادب و احترام اور دیدہ نم کے ساتھ مواجہ شریف میں کھڑے ہوئے پایا۔'' ☆۱

اللہ تعالیٰ نے جناب کشفی کو بیدار دل اور تابندہ ذہن سے نواز رکھا ہے، ذہن و دل کی اس پاکیزہ ہم آہنگی کا فیض ہے کہ وہ جب بھی نعت کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی اس منزّہ فکری اور مطہر قلبی کے باعث قاری کو بھی بقدر ظرف گداز و تپش اور نیاز و ناز کی دولت ملتی ہے اور اس کا تصور اس ستھرے اور نکھرے ماحول میں پہنچ جاتا ہے جس کے حسن و تاثر کو الفاظ کا کوئی سا پیرایۂ اظہار کا کوئی سا سلیقہ اور شاعری کا کوئی سا قرینہ بھی بیان نہیں کر سکتا۔ اسی سے ہلکا سا اندازہ ہوسکتا ہے کہ صاحب تحریر خود سرور و کیف کے کن جذبوں سے بہرہ ور ہے۔ انھوں نے محسن کاکوروی کے کلام میں مدتوں پہلے پڑھا تھا کہ رات کعبے میں برائے وضو داخل ہو رہی ہے، سناٹا اور انفاس ہوا ہم آغوش ہیں اور غلاف کعبہ میں جذبات

جناب سیّد محمد ابوالخیر کشفی جیسی خود شناس اور خدا آگاہ شخصیات روز روز پیدا نہیں ہوتیں، ان کے لیے گردش لیل ونہار کو مدتوں منتظر رہنا پڑتا ہے۔ اس دور فتنۂ آخر زماں میں دل و نگاہ، آگہی کے اسی کیف کے لیے ترس رہے ہیں۔ یہ دن یادوں سے معطر ہیں نہ راتیں اشکوں سے منور، نہ چراغ رخ ہے نہ شمع وعدہ، گل ہیں کہ سرشاخ جل گئے ہیں اور دل ہیں کہ سرشام بجھ گئے ہیں... کوئی ویرانی سی ویرانی ہے، ساری دنیا ہماری حالت پر ہنس رہی ہے مگر ہمیں اپنی حالت پر رونا نہیں آتا:

ہم وہ تھے جن کو خندۂ گل نے جگا دیا
ہم وہ ہیں جو خروش سلاسل میں سو گئے

ایسے میں اگر کوئی شخصیت ایسی ہے جس کے دل میں ایمان کی حلاوت، روح میں خشیتِ الٰہی کی جھلک، آنکھ میں حیا کی معصومیت اور تحریر میں عدل و خیر کی تعبیر ہے تو جہاں اس نعمت کے لیے بارگاہ خداوندی میں سجدہ ریز استحسان ہوں وہاں اس شخصیت کے لیے بھی اپنے دل کی دعائیں اور قلم کی نوائیں وقف کر دینا اپنا فرض انسانیت جانتا ہوں، ایسے خوش نصیب خال خال ہیں جو التجاؤں کے جلو قلم اٹھاتے، حرف حرف اجالتے، لفظ لفظ نکھارتے، خود نعت کہتے اور دوسروں کی لکھی ہوئی نعتیں پڑھتے پڑھتے دیار شب سے سواد فجر تک پہنچ جاتے ہیں تو بے ساختہ اپنی کیفیت کا اظہار یوں کر جاتے ہیں... ''لیجیے فجر کی پہلی اذان فضا میں بلند ہو رہی ہے، مؤذن اللہ تعالیٰ کی وحدت اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی گواہی دے رہا ہے اور اب وہ کہنے ہی والا ہے کہ الصلوۃ خیر من النوم۔ اذان فجر کے بارے میں اقبال نے کیا خوب کہا ہے:

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا

آج رات آپ کی شاعری نے مجھے غفلت سے دور رکھا اور میں آپ کے دل کی دھڑکنیں سنتا رہا اور میں نے اپنے آپ کو روحانی طور پر ادب و احترام اور دیدہ نم کے ساتھ مواجہ شریف میں کھڑے ہوئے پایا۔'' ☆۱

اللہ تعالیٰ نے جناب کشفی کو بیدار دل اور تابندہ ذہن سے نواز رکھا ہے، ذہن و دل کی اس پاکیزہ ہم آہنگی کا فیض ہے کہ وہ جب بھی نعت کے موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی اس منزّہ فکری اور مطہر قلبی کے باعث قاری کو بھی بقدرظرف گداز و تپش اور نیاز و ناز کی دولت ملتی ہے اور اس کا تصور اس ستھرے اور نکھرے ماحول میں پہنچ جاتا ہے جس کے حسن و تاثر کو الفاظ کا کوئی سا پیرایۂ اظہار کا کوئی سا سلیقہ اور شاعری کا کوئی سا قرینہ بھی بیان نہیں کرسکتا۔ اسی سے ہلکا سا اندازہ ہوسکتا ہے کہ صاحب تحریر خود سرور و کیف کے کن جذبوں سے بہرہ ور ہے۔ انھوں نے محسن کاکوروی کے کلام میں مدتوں پہلے پڑھا تھا کہ رات کعبے میں برائے وضو داخل ہو رہی ہے، سناٹا اور انفاس ہوا ہم آغوش ہیں اور غلاف کعبہ میں جذبات کی لرزش خفی، محسن چشم تصور سے دیکھتا ہے اور کشفی صاحب جب حرمِ کعبہ میں پہلی بار داخل ہوتے ہیں تو ان کا دل زندہ انھی اشعار کی اثر آفرینیاں وہاں محسوس کرتا ہے... میں نے دیکھا کہ غلاف کعبہ میں حرکت سی تھی۔ غلاف کعبہ کا طواف کر رہا تھا رات نے غلاف کو اپنا پردہ بنا لیا تھا۔ انسانی آوازوں کے درمیان خاموشی کا ایک جزیرہ تھا اور رات خاموشی کے اس جزیرے میں انفاس ہوا سے پیام دوست سن رہی تھی، سنگ اسود ازلی اور ابدی خوشبوؤں کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔☆۲

مدینہ شریف میں حاضری، ہمت کی بات ہے حق یہ ہے کہ احقر سے تو ڈھب سے سلام بھی پیش نہ ہوسکا تھا اور علامہ اقبال علیہ الرحمہ اقبال جاوید کے در دل پر بار بار دستک دیتا تھا کہ:

چوں بنام مصطفیٰ ﷺ خوانم درود
از خجالت آب می گردد وجود
چوں نداری از محمد ﷺ رنگ و بو
از درود خود میالا نام او ﷺ

دل کی خباثتیں اور نظر کی حماقتیں ابل ابل کر اور ابھر ابھر کر روبرو آتی تھیں، نگاہ اُٹھتی نہ تھی، لب ہلتے نہ تھے اور قدم اٹھتے نہ تھے... اور... زبان بمشکل یہی کہہ پائی تھی:

نہ فکر بس میں، نہ قابو نظر پہ ہے آقا
دل و دماغ کی دنیا ہے تیرگی کے لیے
زمانے بھر میں تجلی بکھیرنے والے
کچھ اہتمام، مرے دل کی روشنی کے لیے

حق یہ ہے کہ ندامت کا یہ احساس جب اپنے نقطۂ عروج کو چھوتا ہے تب لطف و کرم انسان کا احاطہ کر لیتا ہے اور کرب، آسودگی میں بدل جاتا ہے کہ وہ ذات پاک ﷺ رؤف و رحیم بھی حد سے زیادہ ہے اور اس کی دعا بھی وجہ سکون دل۔ جناب کشفی، مدینہ منورہ میں حاضری کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں... میں نے اپنے آپ کو مسجدِ نبوی ﷺ کے روبرو پایا، اب میں آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور اس آئینے میں میرے مقابل تمام عیوب برہنگی تھے، اپنی زندگی کی ہر شکن میرے سامنے تھی، میری نگاہیں جھک گئیں، ہمت کر کے پھر نگاہیں آئینے کی سمت اٹھائیں، اس آئینے میں میرے سارے داغ موجود تھے اور ان داغوں کے درمیان میرا دل تھا۔ سیاہ۔ ہوس لالہ رخاں سے داغ داغ... مگر ان داغوں کے درمیان ایک روشن عشق محمدی ﷺ کا وہ نقش تھا جو ہر مسلمان کی طرح میرے دل میں بھی موجود تھا اور جسے مسجد نبوی ﷺ کے آئینے نے مہر صفت بنا دیا اور آئینے نے مہر صفت دل بلکہ مہر درخشاں کو اپنی آغوش میں لے لیا۔☆۳

انسان جب دیار خدا و رسول ﷺ میں حاضری دیتا ہے تو وہ سراپا التجا بن جاتا ہے، کائنات نوک مژہ پر تل جاتی ہے، ہر لحہ دعاؤں سے مستنیر رہتا ہے وہاں درد چھکتا اور آنسو بولتے ہیں لرزشوں کو زبان مل جاتی ہے اور دھڑکنیں، داستان دل کہتی ہیں :

مرے درد نہاں کا حال محتاج بیاں کیوں ہو
جو لفظوں کا ہو مجموعہ وہ میری داستاں کیوں ہو

جناب کشفی کو جب بھی اللہ تعالیٰ نے وہاں حاضری کی توفیق دی تو انھوں نے غزل کے اشعار میں حضوری کا جو کیف محسوس کیا وہ ان کی حیات مستعار کی متاع عزیز بن گیا اور ان اشعار کو آج بھی جب ان کی تنہائی دہراتی ہے تو نظر میں پھول کھل کر اور دل میں شمعیں جل کر تصور کی دنیا کو رعنا بنا جاتی ہیں کہ :

بچھڑ کے بھی تری یادوں کی رہ گزر میں رہے
سفر کے بعد بھی ہم حالت سفر میں رہے

ایک مقام پر وہ اپنی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں... راقم الحروف کو قیام ارضِ مقدس کے دوران میں اردو کا کوئی اور شاعر اتنا یادنہیں آتا جتنا مولانا حسرت موہانی (اور ان کے اشعار) یاد آتے ہیں، غالباً یہ دل بیدار حسرت کے نغموں کی جز ا ہے اکثر میں نے اپنی کیفیت مولانا کے شعروں کے ذریعے بیان کی ہے یا مولانا میری دید میں شامل ہوگئے ہیں۔ 'گنبد' اور 'دریا' کے درمیان کوئی ذہنی اور شعری تلازمہ نہیں ہے مگر دور سے جب گنبدِ خضریٰ پر نظر پڑتی ہے تو مولانا یاد آجاتے ہیں:

جب دُور سے وہ گنبدِ خضریٰ نظر آیا
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آیا

مولانا کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں نے اس تلازمہ کو جنم دیا ہے۔ ایک بار میں نے غار ثور تک پہنچنے کا تصور کیا۔ لیکن اپنی صحت اور غار کے راستے کی دشواریوں کے خیال اور اندیشے نے اس قصد کو فسق کیا۔ اس مجبوری اور بے قراری کی ملی جلی کیفیت اور فضا میں مولانا یاد آئے:

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے شوق کی بلندی، مرے حوصلے کی پستی[۴]

غزل کے اشعار نے ان کی تحریروں ہی کو نہیں، ان کی تمناؤں کو بھی رنگ و آہنگ کی ایک دنیا دی ہے۔ حضرت ثاقب کانپوری نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ ''غزل کی علامتوں اور اشاروں کی معنویت ہر دور میں بدل جاتی ہے۔'' مگر جناب کشفی کے ہاں یہ معنویت ہر موقع اور ہر ساعت بدل جاتی ہے:

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا

انسان جب دیارِ خدا و رسول ﷺ میں حاضری دیتا ہے تو وہ سراپا التجا بن جاتا ہے، کائنات نوکِ مژہ پر تل جاتی ہے، ہر لمحہ دعاؤں سے مستنیر رہتا ہے وہاں درد چھلکتا اور آنسو بولتے ہیں لرزشوں کو زبان مل جاتی ہے اور دھڑکنیں، داستانِ دل کہتی ہیں :

مرے دردِ نہاں کا حال محتاجِ بیاں کیوں ہو
جو لفظوں کا ہو مجموعہ وہ میری داستاں کیوں ہو

جناب کشفی کو جب بھی اللہ تعالیٰ نے وہاں حاضری کی توفیق دی تو انھوں نے غزل کے اشعار میں حضوری کا جو کیف محسوس کیا وہ ان کی حیاتِ مستعار کی متاعِ عزیز بن گیا اور ان اشعار کو آج بھی جب ان کی تنہائی دہراتی ہے تو نظر میں پھول کھل کر اور دل میں شمعیں جل کر تصور کی دنیا کو رعنا بنا جاتی ہیں کہ :

بچھڑ کے بھی تری یادوں کی رہ گزر میں رہے
سفر کے بعد بھی ہم حالتِ سفر میں رہے

ایک مقام پر وہ اپنی کیفیت کا اظہار یوں کرتے ہیں... راقم الحروف کو قیامِ ارضِ مقدس کے دوران میں اردو کا کوئی اور شاعر اتنا یاد نہیں آتا جتنا مولانا حسرت موہانی (اور ان کے اشعار) یاد آتے ہیں، غالباً یہ دلِ بیدار حسرت کے نغموں کی جزا ہے اکثر میں نے اپنی کیفیت مولانا کے شعروں کے ذریعے بیان کی ہے یا مولانا میری دید میں شامل ہوگئے ہیں۔ 'گنبد' اور 'دریا' کے درمیان کوئی ذہنی اور شعری تلازمہ نہیں ہے مگر دور سے جب گنبدِ خضریٰ پر نظر پڑتی ہے تو مولانا یاد آجاتے ہیں:

جب دُور سے وہ گنبدِ خضریٰ نظر آیا
بہتا ہوا اک نور کا دریا نظر آیا

مولانا کی آنکھوں میں جھلملاتے آنسوؤں نے اس تلازمہ کو جنم دیا ہے۔ ایک بار میں نے غارِ ثور تک پہنچنے کا تصور کیا۔ لیکن اپنی صحت اور غار کے راستے کی دشواریوں کے خیال اور اندیشے نے اس قصد کو فسق کیا۔ اس مجبوری اور بے قراری کی ملی جلی کیفیت اور فضا میں مولانا یاد آئے:

غم آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مرے شوق کی بلندی، مرے حوصلے کی پستی ☆۴

غزل کے اشعار نے ان کی تحریروں ہی کو نہیں، ان کی تمناؤں کو بھی رنگ و آہنگ کی ایک دنیا دی ہے۔ حضرت ثاقب کانپوری نے ایک مقام پر لکھا تھا کہ "غزل کی علامتوں اور اشاروں کی معنویت ہر دور میں بدل جاتی ہے۔" مگر جناب کشفی کے ہاں یہ معنویت ہر موقع اور ہر ساعت بدل جاتی ہے:

نیا ہے لیجیے جب نام اس کا
بہت وسعت ہے میری داستاں میں

گو ہر دور نعت ہی کا دور رہا ہے کہ یہ صنفِ سخن ازل انوار بھی ہے اور ابد آثار بھی۔ مگر دورِ حاضر میں نعتوں کی بارش ہورہی ہے۔ ہر نوع کی نعتیں لکھی جارہی ہیں، دل سے بھی اٹھ رہی ہیں۔ زبان سے بھی اور محض قلم سے بھی... جو نعت قاری کے دل کی دھڑکن کو تیز نہیں کرتی، چاہت کو کیف اور انتظار کو اضطراب عطا نہیں کرتی وہ فکری گداز سے تہی، صرف خوب صورت الفاظ کا مجموعہ ہے، رنگینیٔ حسنِ بیان اپنی جگہ، مگر سوزِ دروں کی آنچ کا مقام اپنا ہے اور دونوں کا حسین امتزاج ہی نگاہ کو مائل، ذہن کو قائل اور دل کو گھائل کیا کرتا ہے آج بفضلہٖ تعالیٰ قابلِ قدر نعتیں بھی لکھی جارہی ہیں اور یہ نعتیں فی الواقع حبِ رسول ﷺ کو تازہ تر کررہی ہیں اور حضور ﷺ کی اس محبت کے طفیل، ہمارے ایمان پر نکھار آرہا ہے، ہمارا تشخص واضح ہورہا ہے، ہمارا حوالہ ایک حقیقت بن رہا ہے اور یہی محبت، یہی تشخص اور یہی حوالہ ہماری نشاۃ ثانیہ کا ایک خوبصورت ذریعہ ہے سچی بات یہ ہے کہ... اگر ذکرِ محمد عربی ﷺ یوں نہ ہورہا ہوتا تو ہمارے معاشرے کی صورت کیا ہوتی؟ ہم اپنا تشخص کھو بیٹھتے، اقدارِ حیات سے محروم ہوتے، کسی جبر کے خلاف کوئی آواز نہ اٹھتی، غیروں کی تقلید ہماری اجتماعیت کو مٹا دیتی۔ آج ہمیں احساسِ زیاں ہے تو اسی ذکرِ گرامی سے اور یہی ذکر ہماری بازآفرینی کے تمام امکانات اپنے دامن میں رکھتا ہے کہ درِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستگی ہی ہمارے ایمان کی کسوٹی اور دکھ درد کا علاج ہے۔☆۵

انسان کے دل میں حقیقت، حسن اور خیر کی طلب کا جو والہانہ جذبہ ہے اس کے بے ساختہ اظہار کا نام شعر ہے۔ حرفِ تمنا جو روبرو نہ کہا جاسکے وہ شعر کے پردے میں بے اختیار ادا ہوجاتا ہے۔ عبدالرحمٰن بجنوری کے الفاظ میں "شعر کو تصویر پر یہ ترجیح ہے کہ تصویر ساکن ہے اور شعر متحرک، تصویر اپنے قائم کردہ انداز کو نہیں بدل سکتی، شعر ایک کیفیت کی مختلف حرکات کو ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے، تصویر رقبۂ حیات پر ایک نقطہ ہے، شعر ایک دائرہ ہے" اب درج ذیل اشعار میں جناب کشفی کی چلتی پھرتی، بولتی چالتی اور سمجھتی سمجھاتی شخصیت کے مختلف پہلو دیکھیے اور پھر اپنے دل کے آئینے میں جھانکیے اور سوچیے کہ یہ متحرک تصویر، تصور کا حسن ہے یا نہیں:

قرآن کے اوراق میں پڑھتا ہوں انھی کو
اس مصحفِ ناطق کی تلاوت پہ نظر ہے

☆

غیب بھی ان کے کرم سے مری نظروں پہ کھلا
میں نے دیکھی ہے مدینے میں بہشت صد رنگ

☆

خاموش سی اک طرز فغاں لے کے چلا ہوں
آنکھوں سے نہاں اشک رواں لے کے چلا ہوں
سرکارﷺ کے قدموں سے جبیں، عرش معلّی
محراب کے، سجدوں میں نشاں لے کے چلا ہوں
اب گنبدِ خضری کے سوا عکس، نہ منظر
آنکھوں میں محبت کا بیاں لے کے چلا ہوں
ہر قید زماں اور مکاں ہے مری نخچیر
جو زندہ رہے اب وہ سماں لے کے چلا ہوں
طیبہ کی ہر اک راہ مری راہ نما ہے
سرکارﷺ کے قدموں کے نشاں لے کے چلا ہوں

☆

اسمِ محمد سے اندھیروں میں جلائی قندیل
برقِ تابندہ ہے کشفی کی زباں کو دیکھو

☆

میرے اشکوں سے بنے گنبدِ خضرٰی کی شبیہ
تیری رحمت ہو عطا دیدۂ نم کی صورت

☆

اوراق شمائل کا یہ اعجاز تو دیکھو
آنکھوں میں بسی صورت سلطان مدینہ

☆

روضۂ پاک کا ہر نقش بصیرت کا نشاں
پھر مجھے ساعت بیدار کی یاد آتی ہے
وادیٔ خواب میں دیدار کا لمحہ چمکا
پھر اسی لذت دیدار کی یاد آتی ہے

☆

خاموش سی اک طرزِ فغاں لے کے چلا ہوں
آنکھوں سے نہاں اشک رواں لے کے چلا ہوں
سرکارﷺ کے قدموں سے جبیں، عرش معلّی
محراب کے، سجدوں میں نشاں لے کے چلا ہوں
اب گنبدِ خضریٰ کے سوا عکس، نہ منظر
آنکھوں میں محبت کا بیاں لے کے چلا ہوں
ہر قید زماں اور مکاں ہے مری زنجیر
جو زندہ رہے اب وہ سماں لے کے چلا ہوں
طیبہ کی ہر اک راہ مری راہ نما ہے
سرکارﷺ کے قدموں کے نشاں لے کے چلا ہوں

☆

اسمِ محمد سے اندھیروں میں جلائی قندیل
برقِ تابندہ ہے کشفی کی زباں کو دیکھو

☆

میرے اشکوں سے بنے گنبدِ خضریٰ کی شبیہ
تیری رحمت ہو عطا دیدۂ نم کی صورت

☆

اوراق شمائل کا یہ اعجاز تو دیکھو
آنکھوں میں بسی صورت سلطان مدینہ

☆

روضۂ پاک کا ہر نقش بصیرت کا نشاں
پھر مجھے ساعت بیدار کی یاد آتی ہے
وادیٔ خواب میں دیدار کا لمحہ چمکا
پھر اسی لذت دیدار کی یاد آتی ہے

کشفی کی نگاہوں میں اب نقش نہیں کوئی
محراب تہجد میں سرکارﷺ نظر آئے

جناب کشفی کے قلم پر جہاں بھی اور جب بھی حضورﷺ کا ذکر آتا ہے تو ان کی نگاہوں کی تمنائیں، قلم کی نوک پر لو دیتی محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی سوچ ایک ہی محور کے گرد گردش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ کوئی توصیفی شعر ہو یا جملہ، جہاں بھی وہ بشری خصوصیات سے بلند تر کوئی نکتہ دیکھتے ہیں تو ان کا ذہن فوراً بشر سے خیرالبشر اور محدود سے لامحدود کی طرف منتقل ہوجاتا ہے خواہ کہنے والے کے ذہن میں وہ نکتہ ہو یا نہ ہو، ان کی ذہنی اور قلبی وابستگی دیار نازہی کے طواف میں مصروف رہتی ہے کہ :

وہ تمام ایک جلوہ، میں تمام ایک سجدہ
مری بندگی میں حائل نہ جبیں نہ آستانہ

اللہ تعالیٰ کا ذکر بہرنوع بلند ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پاکﷺ کے ذکر کو بھی رفعت عطا فرمائی ہے اور اس رفعت کی عظمت یہ ہے کہ اوقات عالم کا ایک ثانیہ بھی ایسا نہیں گزرتا جو اس ذکر سے معمور نہیں ہوتا، یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ طلوع وغروب آفتاب کے ضابطے ہر مقام پر مختلف ہیں۔ کہیں دن کہیں رات، اوقات بھی مختلف۔ یوں کہیں نہ کہیں نماز کا وقت ہوتا ہے گویا درود وسلام کے نغمے ہر لحظہ گونجتے رہتے ہیں اور نعت درود وسلام ہی کی ایک نغماتی شکل ہے... انسانیت کی پوری تاریخ میں کسی نبی کا نام معجزۂ الٰہی کے درجے پر فائز نظر نہیں آتا۔ ''محمد'' ﷺ یہ لفظ کامل ترین ثنا اور نعت ہے۔ محمدﷺ وہ ہے جو موجب توصیف ہو، مجموعۂ خوبی ہو اور جس سے زیادہ تکمیل وکمال آدمیت و اخلاق کا کوئی اور نمونہ اور نمایندہ نہ ہو اور جس کا حق پورا کردیا گیا ہو۔ ذات وشخصیت اور نام کی کامل ہم آہنگی پہلی اور آخری بار حضورﷺ کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ یہی نام فکر کا سرچشمہ اور جذبہ کے طلوع ہونے کا مطلع ہے اور یہی نام ''نعت کے الفاظ'' کی ٹکسال ہے یہی نام کارگہہ فکر ہے اور اس میں ڈھلنے والا ہر ستارہ ہمارے مقدر کی سمت کا اشارہ ہے محمدﷺ اور اسمِ محمدﷺ کے کمالات چودہ صدیوں میں وقت کے انقلابات کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آرہے ہیں یہ وہ پھول ہے جس کا کھلنا جاری ہے ہر پنکھڑی کے کھلنے کے ساتھ صل اللہ کی آواز چٹک کا اعلان بن کر کانوں سے قلب تک کا سفر کرتی ہے۔ اس ذات کی مدح وثنا کا سلسلہ جاری ہے۔ اپنوں کے دل اور غیروں کے ذہن اور فکر، اعتراف عظمت سرور کائناتﷺ میں مصروف ہیں۔☆[٦]

حضورﷺ کا مبارک سینہ انوارِ الٰہی سے مستنیر اور علوم الٰہی سے معمور تھا۔ اس میں کونین کی وسعتیں سمٹ گئی تھیں۔ وہ قرآن پاک کی کیفیات و برکات کا خزینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے متن کو ہزارہا سینوں میں محفوظ کردیا اور نبی پاکﷺ کی سیرت کو ابدالآباد تک

کے لیے مشعل ہدایت بنا دیا کہ وہ اس متن کی ایک بشری تشریح اور عملی توضیح تھی اور...نعت ربّ کریم کے وعدۂ بشارت رفع ذکر کے سلسلہ گراں ارز کی ایک کڑی ہے۔

"**رفعنالک ذکرک**" اس میں 'لکَ' کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔تمھاری خاطر تمھارے ذکر ﷺ کا آوازہ بلند کیا گیا۔ یہ تسلی اس وقت دی گئی تھی جب باطل کی تہ در تہ اندھیریوں میں شمع رسالت کی لو نے چند ہی قلوب کی فضاؤں میں چراغاں کیا تھا اور اس لمحے سے آج تک یہ ذکر لبوں پر آواز کے دائروں میں، دلوں کی دھڑکنوں میں، پلکوں کے جگنوؤں میں اور شعروسخن کی وادیوں میں جاری ہے۔ اس رفع ذکر کا سلسلہ تو نور محمدی ﷺ کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوگیا اور اس لمحہ سے جب لوح محفوظ پر آپ ﷺ کے اسمائے گرامی محمد ﷺ اور احمد ﷺ ثبت کیے گئے۔حضور سرور دیں علیہ الصلوۃ والسلام نے توحید کو دین کی اساس قرار دیا ہے اور اس ملت کا جگر دیکھیے کہ انھیں کیا کچھ نہ کہنے کے جذبہ کے باوجود اس توحید کی پاسداری کرتی ہے۔ ویسے میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ محمد ﷺ اور احمد ﷺ کا مادہ ح م د ہے۔ یہ وہ ذات گرامی ہے کہ جس کے افعال محمودہ اور صفات محمودہ نے اسے مقام محمود کی بلند ترین مسند پر بٹھا دیا چودہ صدیوں کی دوری کے باوصف حضور ﷺ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہی نہیں بلکہ ان دھڑکنوں کا آہنگ ہیں۔حضور ﷺ کی تعریف کے لیے آپ ﷺ کی صفات اور مقام بلند سے آگہی لازم ہے آپ ﷺ کے حسن و رعنائی کے چشمہ تک پہنچنا واجب ہے اور یہ جاننا ناگزیر ہے کہ مقام محمود وہ مقام ہے جہاں آدمی حزن اور خوف سے بالاتر ہوجاتا ہے حضور ﷺ تو اس مقام پر فائز تھے ہی۔ ان ﷺ کا ذکر بھی ان کے مدح خوانوں کو حزن وخوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔☆۷

نبی کریم ﷺ ہماری پہچان اور ہماری آبرو ہیں کاش ہم بھی محبت اور اطاعت کے ذریعے ان کی پہچان بننے کی کوشش کریں کہ حضور ﷺ کی سچی اطاعت ہی تعلق خاطر کے پاکیزہ سلسلوں کو شگفتہ رکھ سکتی ہے یہ تعلق مرجھا جائے تو ہماری زندگی دھندلا جائے گی، پہچان ماند پڑ جائے گی اور رسوائی مقدر ہوجائے گی:

تجھ سے مل کر زندگی مقصود مہر و ماہ تھی
تجھ سے کٹ کر در بدر بے آبرو ہونے لگی

راغب مرادآبادی نے غالب کے ایک مصرع کی تضمین یوں کی تھی:

جو سب سے محترم بعد خدا ہے
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ہے

اور جناب کشفی اس پر اس اندازہ سے تبصرہ کرتے ہیں کہ توحید کی رفعتیں اور رسالت ﷺ کی عظمتیں اپنی تہیں کھولتی چلی جاتی ہیں وہ لکھتے ہیں... غالبؔ کا یہ شعر بہت خوب صورت ہے لیکن راغب صاحب کی تضمین پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غالبؔ کا دوسرا مصرع

کے لیے مشعل ہدایت بنا دیا کہ وہ اس متن کی ایک بشری تشریح اور عملی توضیح تھی اور...نعت ربّ کریم کے وعدۂ بشارت رفع ذکر کے سلسلہ گراں ارز کی ایک کڑی ہے۔

"رفعنالک ذکرک" اس میں 'لک' کا ٹکڑا ملاحظہ ہو۔ تمھاری خاطر تمھارے ذکر ﷺ کا آوازہ بلند کیا گیا۔ یہ تسلی اس وقت دی گئی تھی جب باطل کی تہ در تہ اندھیریوں میں شمع رسالت کی لو نے چند ہی قلوب کی فضاؤں میں چراغاں کیا تھا اور اس لمحے سے آج تک یہ ذکر لبوں پر آواز کے دائروں میں، دلوں کی دھڑکنوں میں، پلکوں کے جگنوؤں میں اور شعر وسخن کی وادیوں میں جاری ہے۔ اس رفع ذکر کا سلسلہ تو نور محمدی ﷺ کی تخلیق کے ساتھ ہی شروع ہوگیا اور اس لمحہ سے جب لوح محفوظ پر آپ ﷺ کے اسمائے گرامی محمد ﷺ اور احمد ﷺ ثبت کیے گئے۔ حضور سرور دیں علیہ الصلوۃ والسلام نے توحید کو دین کی اساس قرار دیا ہے اور اس ملت کا جگر دیکھیے کہ انھیں کیا کچھ نہ کہنے کے جذبہ کے باوجود اس توحید کی پاسداری کرتی ہے۔ ویسے میں یہ کیسے بھول جاؤں کہ محمد ﷺ اور احمد ﷺ کا مادہ ح م د ہے۔ یہ وہ ذات گرامی ہے کہ جس کے افعال محمودہ اور صفات محمودہ نے اسے مقام محمود کی بلند ترین مسند پر بٹھا دیا چودہ صدیوں کی دوری کے باوصف حضور ﷺ ہمارے دلوں کی دھڑکنوں میں شامل ہی نہیں بلکہ ان دھڑکنوں کا آہنگ ہیں۔ حضور ﷺ کی تعریف کے لیے آپ ﷺ کی صفات اور مقام بلند سے آگہی لازم ہے آپ ﷺ کے حسن و رعنائی کے چشمہ تک پہنچنا واجب ہے اور یہ جاننا ناگزیر ہے کہ مقام محمود وہ مقام ہے جہاں آدمی حزن اور خوف سے بالاتر ہوجاتا ہے حضور ﷺ تو اس مقام پر فائز تھے ہی۔ ان ﷺ کا ذکر بھی ان کے مدح خوانوں کو حزن وخوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔[☆۷]

نبی کریم ﷺ ہماری پہچان اور ہماری آبرو ہیں کاش ہم بھی محبت اور اطاعت کے ذریعے ان کی پہچان بننے کی کوشش کریں کہ حضور ﷺ کی سچی اطاعت ہی تعلق خاطر کے پاکیزہ سلسلوں کو شگفتہ رکھ سکتی ہے یہ تعلق مرجھا جائے تو ہماری زندگی دھندلا جائے گی، پہچان ماند پڑ جائے گی اور رسوائی مقدر ہوجائے گی:

تجھ سے مل کر زندگی مقصود مہر و ماہ تھی
تجھ سے کٹ کر در بدر بے آبرو ہونے لگی

راغب مرادآبادی نے غالب کے ایک مصرع کی تضمین یوں کی تھی:

جو سب سے محترم بعد خدا ہے
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا ہے

اور جناب کشفی اس پر اس اندازہ سے تبصرہ کرتے ہیں کہ توحید کی رفعتیں اور رسالت ﷺ کی عظمتیں اپنی تہیں کھولتی چلی جاتی ہیں وہ لکھتے ہیں... غالبؔ کا یہ شعر بہت خوب صورت ہے لیکن راغب صاحب کی تضمین پڑھ کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے غالبؔ کا دوسرا مصرع سو سال سے زیادہ عرصے سے اس مصرع کا منتظر تھا۔ غالبؔ نے وحدت الوجود کی بات کی تھی۔ ذات رب میں فنا ہوکر مقام بقا پر پہنچنا، مقصود حیات ہوسکتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہماری پہچان اور تشخص کا سوال ہے اس کا رشتہ حضور ﷺ سے ہے۔[☆۸]

اور حضور ﷺ خدا کے بھیجے ہوئے وہ آخری رسول تھے جن پر تمام دنیاوی اور اخروی نعمتیں تمام ہوگئیں تھیں اور ان ﷺ جیسا نہ ہماری بزم خیال میں نہ دکان آئینہ ساز میں...اور وہ آخری آدمی، انسان کی تقدیر ہی نہ تھا بلکہ فرش نشیں ہوتے ہوئے، عرش کی توقیر بھی تھا اور...اب خدا کے اس آخری رسول ﷺ کا عہد ہے جس کا دامن روز حشر سے بندھا ہوا ہے۔ وہ جو برزخ کبریٰ ہے۔ انسان اور خدا کے درمیان۔ وہ جو عرش وفرش کے درمیان وسیلہ ہے۔ محمد ﷺ انسان کی تقدیر کا دوسرا نام ہے اور ان کا لایا ہوا دین۔ تقدیر کائنات ہے وہ جو انسان کی تقدیر ہے، جس ﷺ کی رسالت پایان وقت تک پھیلی ہوئی ہے، اس کے معجزے بھی ماضی کا حصہ نہیں ہوسکتے۔ حضور ﷺ کے دو جاوداں معجزے ہیں۔ قرآن حکیم اور اسوۂ حسنہ ﷺ۔

لیکن ارباب نظر کے نزدیک حضور ﷺ کے دوسرے معجزات بھی ابدیت آثار ہیں نبیٔ اکرم ﷺ کا کوئی معجزہ اور زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوسکتا جس کا رشتہ اور علاقہ عالم انسانیت سے نہ ہو۔[☆۹]

جناب کشفی نے مقام رسالت مآب ﷺ کو اپنی تحریروں میں، جابجا سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ بالکل درست فرماتے ہیں کہ اسی نام اور اسی ذکر نے ازل کو ابد سے ملا رکھا ہے۔ ہر دنیاوی سعادت اور ہر اخروی سرخروئی اسی چوکھٹ سے وابستہ ہے، جہاں بھی اُجالا ہے وہ اسی سراج منیر کا فیض ہے اور جہاں بھی اندھیرا ہے وہ اسی نور کو آواز دے رہا ہے...دین و دنیا۔ یہ بھی تو دو کرے ہیں آپ کسی بھی انتہا پر پہنچ جائیں۔ ازل سے ابد تک کا سفر کرلیں، دونوں انتہاؤں کا توازن وجود محمد عربی ﷺ کا صدقہ نظر آئے گا۔ قرآن حضور ﷺ کی صداقت کا ابدی معجزہ ہے۔ لیکن ذاتِ رسولِ عربی ﷺ خدا کی بے نشانی کا نشاں اور اس کے ہونے کی دلیل ہے۔[☆۱۰]

اقبالؒ کے درج ذیل خوب صورت اشعار کے اثرات جناب کشفی کی تحریروں میں جابجا ملتے ہیں:

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نور مصطفیٰ اُورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ ست

اور ان کا یہ جملہ نثری نعت ہی تو ہے کہ "کائنات کی ہر بہار سامانی نور مصطفیٰ ﷺ کا پرتو جمیل ہے اور بہار سامانی کے ہر امکان کے پیچھے اسی نام کا عکس ہے"[☆۱۱] اقبالؒ دورِ حاضر کا ایک عظیم مسلمان تھا۔

حضور ﷺ کے تعلق خاطر نے اسے بالا بلند کر دیا تھا اور اسی محبت نے اسے بلال مشرق اور کلیم ایشیا بنا دیا تھا۔ جناب کشفی کے الفاظ میں ''حضور ﷺ کی ذات اقبالؒ کے لیے سب سے بڑا حوالہ، نقطۂ تناظر اور محلِ تناظر ہے۔ وہ ختمی مرتبت ﷺ کے حوالے سے زندگی کو دیکھتے ہیں اور زندگی کے احوال، اطراف و جوانب کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں اس ذات اقدس و اکمل کی گیرائی و وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جہاں کہیں جہان رنگ و بو نظر آئے جس کی زمین سے آرزو اور تمناؤں کے ہزار رنگ پھول اُگ رہے ہوں۔ اس جہان رنگ و بو میں حضور ﷺ کا نور نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں نور ہے، آرزو ہے، رنگ و بو ہے۔ وہاں ہر شے، ہر وجود تلاش مصطفیٰ ﷺ میں مصروف نظر آتا ہے۔''☆۱۲

اب ان کے مجموعۂ نعت ''نسبت'' کے آئینے میں اسی خیال کو شعری پیرہن میں دیکھیے:

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشت خاک تری جستجو میں زندہ ہے
ظلمت نے چراغ اپنے بجھائے تو ہیں لیکن
اک اسم محمد ﷺ تو اجالے کے لیے ہے

☆

رحمۃ للعالمیں ﷺ کے نور سے رخشندہ ہو
ایسا انداز نظر سب سے جدا ہم کو ملے

☆

غبار تشنہ لبی میں نگاہ امت کو
اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے
جہاں میں ذات محمد ﷺ میں سینکڑوں جلوے
نگاہ شوق کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے
لولاک لما، ایک حقیقت کا ہے اظہار
ہے نقش جہاں پرتو تابان محمد ﷺ

☆

فصل خزاں میں احمد مختار ﷺ سے بہار
وہ رنگ اور نمود کا اک دائرہ بھی ہے

حضورﷺ کے تعلق خاطر نے اسے بالا بلند کر دیا تھا اور اسی محبت نے اسے بلال مشرق اور کلیم ایشیا بنا دیا تھا۔ جناب کشفی کے الفاظ میں ''حضورﷺ کی ذات اقبالؒ کے لیے سب سے بڑا حوالہ، نقطۂ تناظر اور محلِ تناظر ہے۔ وہ ختمی مرتبت ﷺ کے حوالے سے زندگی کو دیکھتے ہیں اور زندگی کے احوال، اطراف و جوانب کا جائزہ لیتے ہوئے انھیں اس ذات اقدس و اکمل کی گیرائی و وسعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس دنیا میں جہاں کہیں جہان رنگ و بو نظر آئے جس کی زمین سے آرزو اور تمناؤں کے ہزار رنگ پھول اُگ رہے ہوں۔ اس جہان رنگ و بو میں حضورﷺ کا نور نظر آتا ہے۔ جہاں کہیں نور ہے، آرزو ہے، رنگ و بو ہے۔ وہاں ہر شے، ہر وجود تلاش مصطفیٰ ﷺ میں مصروف نظر آتا ہے۔''☆[12]

اب ان کے مجموعۂ نعت ''نسبت'' کے آئینے میں اسی خیال کو شعری پیرہن میں دیکھیے:

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشت خاک تری جستجو میں زندہ ہے
ظلمت نے چراغ اپنے بجھائے تو ہیں لیکن
اک اسم محمدﷺ تو اجالے کے لیے ہے

☆

رحمۃ للعالمین ﷺ کے نور سے رخشندہ ہو
ایسا انداز نظر سب سے جدا ہم کو ملے

☆

غبار تشنہ لبی میں نگاہ امت کو
اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے
جہاں میں ذات محمدﷺ میں سینکڑوں جلوے
نگاہ شوق کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے
لولاک لما، ایک حقیقت کا ہے اظہار
ہے نقش جہاں پرتو تابان محمدﷺ

☆

فصل خزاں میں احمد مختارﷺ سے بہار
وہ رنگ اور نمود کا اک دائرہ بھی ہے

کردار جس کا حشر کے دن تک مثال ہے
قائم رہے فضا میں وہ ایسی صدا بھی ہے
معراج جس کی آدم خاکی کا ہو عروج
اس کے سوا جہاں میں کوئی دوسرا بھی ہے؟
نام اس کا لب کے واسطے اک موج سلسبیل
پیشانئ نظر کے لیے نقش پا بھی ہے

حضورﷺ کی رسالت خود شناسی سے لے کر خدا شناسی تک کا ایک ایسا ذریعہ ہے کہ ویسا کامل ذریعہ کسی بھی فکری، مذہبی اور دنیاوی نظام کے پاس نہیں ہے۔ آپ ﷺ کے نقوش پا تک پہنچ جانے کا نام ہی انسانی معراج ہے... انسان کے لفظ کا مادہ ا۔ ن۔ س ہے اور اس مادہ کے مفاہیم میں مشاہدہ، دیکھنا اور احساس کرنا شامل ہے۔ انسان نے اس خاکداں میں آکر آنکھ کھولی اور زمین و آسمان کے مشاہدے کو تعمیر حیات و ذات کا وسیلہ بنالیا۔ اس نے زمین کو دیکھا، فلک کو دیکھا، مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو دیکھا اور یوں پہلے اپنے آپ کو پہچانا، اپنے خالق کو پہچانا، اس مادہ کے معنی میں یقین، ادراک اور معرفت کے مفاہیم بھی شامل ہیں۔ ان مفاہیم کو سامنے رکھیے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ختم المرسلین ﷺ، فخر دو عالم ﷺ کے ظہور کے واسطے اور وسیلے سے آدمی نے اپنے آپ کو پہچانا، وہی اس کارگہ شیشہ گری کی تخلیق اور ایجاد کا سبب تھے۔ وہ انسانیت کا نقطۂ معراج اور عبد و معبود کے درمیان وصل کی علامت تھے، مشاہدہ انفس و آفاق، احساس کی انتہائی نزاکت اور دیکھنے کا کمال ان ﷺ کی ذات میں مجتمع ہو گیا تھا اور اسی لیے آدمی، انسان اور اس کے کمالات اور امکانات پر غور کرنے والا ہر شخص اسی بارگہ مصطفوی ﷺ میں پہنچ جاتا ہے۔☆[13] حق یہ ہے کہ... سرورِ کائنات ﷺ کی نظر کیمیا اثر سے آدمی کردار اور اعمال کے اعتبار سے یکسر بدل جاتا ہے رات، دن کی چادر اوڑھ لیتی، وحشت، انس اور شائستگی میں بدل جاتی ہے۔ سیرت سازی قرآن حکیم کا موضوع اور نبیٔ اکرم ﷺ کے راستے اور سنت کا حاصل ہے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی تذکار محمد ﷺ سے آدمی کی زندگی نئے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔☆[14]

اب حضور ﷺ کی اعجاز آفرین شخصیت اور انقلاب آفرین سیرت کی ایک جھلک جناب کشفی کی نعتوں کے آئینے میں دیکھئے کہ بعض اوقات جو بات نثر کے کئی صفحے واضح نہیں کر پاتے اسے کسی شعر کے دو مصرعے آئینہ کر جاتے ہیں، بہ قولِ ورڈز ورتھ ''شاعری تمام علم انسانی کی جان اور اس کی لطیف ترین روح ہے۔''

امکان مرے تیری نبوت کی گواہی
تو مطلعِ امکان بشر، سیّد عالم ﷺ

☆

نام سے ان کے بدل جاتا ہے انساں کا وجود
رب کعبہ کا کرم ان کی عطا میں شامل

☆

تاریخ کے ایواں میں اُجالا ہوا جس سے
وہ زندہ و پائندہ نوا سب کے لیے ہے

☆

اک اسم محمدﷺ کے سوا لوح ابد پر
دیوار و دربام حرم کچھ نہیں لکھتے

☆

کس نام سے ملتی ہے شفا اہل جہاں کو
کونین کو یہ حرف دعا کس سے ملا ہے

☆

انسان کی وحدت ہے محمدﷺ کا کرشمہ
اس بزم میں تفریق عرب ہے نہ عجم ہے

☆

آپ کے نام میں ہر لفظ کا مفہوم ملے
میرے سرکارﷺ ہیں ہر دور کی زندہ فرہنگ

☆

ہر اک لفظ کے معنی سے اک جہاں پیدا
تری نوا سے ہوا حرف جاوداں پیدا
یہ اہل سیف و قلم، صاحبان جود و عطا
نقوش پا سے ہوئے کتنے کارواں پیدا

☆

ہر مطلعِ انوار اسی نام سے روشن

☆

نام سے ان کے بدل جاتا ہے انساں کا وجود
رب کعبہ کا کرم ان کی عطا میں شامل

☆

تاریخ کے ایواں میں اُجالا ہوا جس سے
وہ زندہ و پائندہ نوا سب کے لیے ہے

☆

اک اسم محمد ﷺ کے سوا لوح ابد پر
دیوار و دربام حرم کچھ نہیں لکھتے

☆

کس نام سے ملتی ہے شفا اہل جہاں کو
کونین کو یہ حرف دعا کس سے ملا ہے

☆

انسان کی وحدت ہے محمد ﷺ کا کرشمہ
اس بزم میں تفریق عرب ہے نہ عجم ہے

☆

آپ کے نام میں ہر لفظ کا مفہوم ملے
میرے سرکار ﷺ ہیں ہر دور کی زندہ فرہنگ

☆

ہر اک لفظ کے معنی سے اک جہاں پیدا
تری نوا سے ہوا حرف جاوداں پیدا
یہ اہل سیف و قلم، صاحبان جود و عطا
نقوش پا سے ہوئے کتنے کارواں پیدا

☆

ہر مطلعِ انوار اسی نام سے روشن
خورشید کو خیرات ملی اس کی جبیں سے
ہاں اسمِ محمد ﷺ ہے مرے نطق کی توقیر
الفاظ کو مفہوم ملا سرور دیں سے

☆

سرکار ﷺ دوعالم کی بصیرت کا ہے صدقہ
ہر سلسلۂ فکر و نظر زندہ ہے ہم سے
تاریخ، محمد ﷺ کا نشانِ کف پا ہے
انسان کو معراج ملی ان کے قدم سے

دُنیا و آخرت کی ہر معراج، ہر حسن اور ہر توقیر، نام مصطفیٰ ﷺ کو لبوں پر سجانے اور مقام مصطفیٰ ﷺ کو دلوں میں بسانے سے عبارت ہے۔ تعلق کی استواری ہی سے محبت، شاداب رہ کر، غنچہ سے گل اور گل سے گلزار بنتی ہے... ہم سب شجر محمدی ﷺ کے برگ و بار ہیں اور اسی شجر سے وابستگی ہمارے قیام و بقا کی تدبیر ہے۔☆[15] ہم حضور ﷺ پر درود بھیجتے ہیں، یہ درود بھی دراصل دعا ہے جو ہم فی الحقیقت اپنے لیے کرتے ہیں کہ اس خزانۂ رحمت پر جتنی زیادہ رحمت نازل ہوگی ہم ''عالمین'' پر اتنی ہی زیادہ تقسیم ہوگی کہ وہ ﷺ کل بھی رحمت تھے اور آج بھی ہیں اور آنے والے ہر دور کے لیے بھی ان ﷺ کی رحمۃ للعالمینی ہم عاصیوں کی واحد آس ہے... حضور ﷺ کی محبت آدمی کے مرتبوں کو بلند کرتی ہے۔ ان کے لیے مقام محمود کی دعا (بھی) ہمارے لیے اس بلندی سے قربت کا سبب بنے گی کیوں کہ مقام محمود تو ان کے رب کی طرف سے ان کے لیے ہے۔ یہ دعا تو ہمارے لیے ترفع کا ایک وسیلہ ہے۔☆[16]

اب بغیر کسی ترتیب کے مقام رسالت مآب ﷺ کے بارے میں جناب کشفی کے قلم سے نکلے ہوئے کچھ نثر پارے دیکھتے جایئے کہ موتی بکھرے بھی بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

☆حضور ﷺ کو بنی آدم کے بہترین طبقوں میں اور خیرالقرون میں پیدا کیا گیا اور آپ کا قرن، آپ کا قرن ہے اور یہ قرن ہمیشہ ہمیشہ قرن محمد ﷺ کے طور پر تاریخ انسانی کے سر پر درخشاں تاج کی طرح چمکتا رہے گا☆ احمد ﷺ اور محمد ﷺ یہ دونوں نام ایک دوسرے کا ضمیمہ ہیں۔ یہ کائنات اور اہلِ ایمان محمد ﷺ کی ستائش میں مصروف ہیں اور حضور ﷺ کا وجود پاک اللہ تعالیٰ کی حمد میں مصروف تھا۔ محمد ﷺ کے معانی میں یہ مفہوم بھی شامل ہے کہ جس کی بے شمار فضیلتیں حمد و ستائش کی سزاوار ہوں☆ آپ ﷺ نبیٔ توبہ تھے آپ ﷺ کو جنھوں نے دیکھا جنھیں قربت کی سعادت نصیب ہوئی وہ ان راستوں سے پلٹ آئے جو گمراہی کے راستے تھے☆ ہمارے برے اعمال کا خسران آپ ﷺ کے بتائے ہوئے راستے پر لوٹ آنے سے سعادت و توفیق میں بدل جاتا ہے☆ مومن تو آپ ﷺ کے لیے سب کچھ تھے ہی، آپ ﷺ تو کفار

کی بھلائی اور ہدایت کی دعاؤں اور تمنا میں اپنی راتیں یوں کاٹ دیتے کہ کائنات کے دل کی دھڑکنوں میں بھی اضطراب پیدا ہوجاتا☆ حضورﷺ محض اپنی جماعت کی کثرت کی وجہ سے ''سیّد'' نہیں ہیں بلکہ آپﷺ کی ذات توقیر و سعادت اور جلالت و سیادت کا منبع ہے اور انھی عناصر سے آپﷺ کا خمیر گوندھا گیا۔ پھر ''سیّد ولد آدم'' میں تمام زمانوں کے انسان سمٹ آئے ہیں اور ہر دور کے انسانوں کا سردار وہی ہوسکتا ہے جو وجہ تخلیق عالم ہو☆ آپﷺ تو انسان کی قبائے ذات کو اپنے رب کی صفات کے رنگوں میں رنگنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپﷺ کی تعلیمات کا مقصد ہی زمین کو توازن، اعتدال، امن و امان، نور اور عدل کا گہوارہ بنا دینا تھا اور جو فساد بر و بحر پر پھیل گیا تھا۔ اس سے نجات دلانا تھا☆ حضورﷺ کی نبوت وحدت آدم کی دلیل بھی ہے اور اعلان بھی☆ نبیٔ آخر الزماںﷺ کے مواجہ شریف میں آج بھی بے حد پست آواز میں سلام پیش کرنا چاہیے۔ یہاں جنبش لب کا آہنگ بھی برقرار رکھنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی وہ مقام فلک رفعت ہے جس کے بارے میں کہا گیا:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

یہاں اہل ایمان کو فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کے انداز پرواز میں بھی ادب کے قرینے نظر آتے ہیں اور فضا بھی سانس روکے ہوئے دست بستہ کھڑی دکھائی دیتی ہے☆ جو صاحبان عقل ہیں وہ رسول اللہﷺ کی خدمت میں موجہ صبا کے لہجے میں لب کشا ہوتے ہیں☆ حضورﷺ کا احترام آدمی کے تقویٰ کا پیمانہ ہے☆ حضورﷺ کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہوجاتے ہیں اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے☆ آپﷺ کی صفات کی تکرار ہمیں البقرہ سے قرآن حکیم کے آخر تک ملتی ہے اور سیاق و سباق بدلنے سے یہ تکرار نئے نئے پہلوؤں اور مطالب کو سمیٹ کر ایک جہان نو کی تخلیق کرتی ہے☆ اللہ کے احکام کی تقلید اور نبیﷺ کے اتباع سے یہی دنیا جنت کا دیباچہ بن جاتی ہے☆ نذیر میں بشیر کا پہلو بھی موجود ہے۔ نذیر اپنی محبت و شفقت کی بنیاد پر لوگوں کو ان کے غلط طرزِ حیات سے ڈراتا ہے☆ انﷺ کی زندگی کے ہر لمحے اور پہلو کو ایک معجزہ بنا دیا گیا، ایسا معجزہ جو رواں دواں ہے اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک پہنچتا ہے۔ زیادہ درخشاں اور تاب ناک ہوکر، جنت اسی دنیا کا تسلسل اور اسی زندگی کا تکملہ ہے☆ رسول اللہﷺ عادل ترین انسان تھے اس لیے وہ شہادت کے مثالی پیکر ہیں۔ قرآن مجید کتاب عدل ہے جو انسانی معاشرے کو ہر فساد، ہر ناہمواری، ہر ظلم سے بچاتی ہے مسلمان اگر عدل اور اعتدال کی روش کو چھوڑ دے تو وہ انسانوں پر شاہد نہیں رہے گا اور نبیٔ اکرمﷺ کے قلب اطہر کے لیے غم، دکھ اور جراحت کا سبب بنے گا☆ جس کا قلب حضورﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی سے جتنا روشن ہوگا۔ اسی درجہ وہ معتبر ہوگا۔☆[۱۷]

کی بھلائی اور ہدایت کی دعاؤں اور تمنا میں اپنی راتیں یوں کاٹ دیتے کہ کائنات کے دل کی دھڑکنوں میں بھی اضطراب پیدا ہوجاتا☆ حضورﷺ محض اپنی جماعت کی کثرت کی وجہ سے ''سیّد'' نہیں ہیں بلکہ آپﷺ کی ذات توقیر و سعادت اور جلالت و سیادت کا منبع ہے اور انھی عناصر سے آپﷺ کا خمیر گوندھا گیا۔ پھر ''سیّد ولد آدم'' میں تمام زمانوں کے انسان سمٹ آئے ہیں اور ہر دور کے انسانوں کا سردار وہی ہوسکتا ہے جو وجہِ تخلیق عالم ہو☆ آپﷺ تو انسان کی قبائے ذات کو اپنے رب کی صفات کے رنگوں میں رنگنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ آپﷺ کی تعلیمات کا مقصد ہی زمین کو توازن، اعتدال، امن و امان، نور اور عدل کا گہوارہ بنا دینا تھا اور جو فساد بر و بحر پر پھیل گیا تھا۔ اس سے نجات دلانا تھا☆ حضورﷺ کی نبوت وحدت آدم کی دلیل بھی ہے اور اعلان بھی☆ نبیٔ آخر الزماں ﷺ کے مواجہ شریف میں آج بھی بے حد پست آواز میں سلام پیش کرنا چاہیے۔ یہاں جنبش لب کا آہنگ بھی برقرار رکھنا ایمان کی علامت ہے۔ یہی وہ مقام فلک رفعت ہے جس کے بارے میں کہا گیا:

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

یہاں اہل ایمان کو فضا میں اڑتے ہوئے پرندوں کے انداز پرواز میں بھی ادب کے قرینے نظر آتے ہیں اور فضا بھی سانس روکے ہوئے دست بستہ کھڑی دکھائی دیتی ہے☆ جو صاحبان عقل ہیں وہ رسول اللہﷺ کی خدمت میں موجہ صبا کے لہجے میں لب کشا ہوتے ہیں☆ حضورﷺ کا احترام آدمی کے تقویٰ کا پیمانہ ہے☆ حضورﷺ کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قوم مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہوجاتے ہیں اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے☆ آپﷺ کی صفات کی تکرار ہمیں البقرہ سے قرآن حکیم کے آخر تک ملتی ہے اور سیاق و سباق بدلنے سے یہ تکرار نئے نئے پہلوؤں اور مطالب کو سمیٹ کر ایک جہان نو کی تخلیق کرتی ہے☆ اللہ کے احکام کی تقلید اور نبیﷺ کے اتباع سے یہی دنیا جنت کا دیباچہ بن جاتی ہے☆ نذیر میں بشیر کا پہلو بھی موجود ہے۔ نذیر اپنی محبت وشفقت کی بنیاد پر لوگوں کو ان کے غلط طرزِ حیات سے ڈراتا ہے☆ انﷺ کی زندگی کے ہر لمحے اور پہلو کو ایک معجزہ بنا دیا گیا، ایسا معجزہ جو رواں دواں ہے اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک پہنچتا ہے۔ زیادہ درخشاں اور تاب ناک ہوکر، جنت اسی دنیا کا تسلسل اور اسی زندگی کا تکملہ ہے☆ رسول اللہﷺ عادل ترین انسان تھے اس لیے وہ شہادت کے مثالی پیکر ہیں۔ قرآن مجید کتاب عدل ہے جو انسانی معاشرے کو ہر فساد، ہر ناہمواری، ہر ظلم سے بچاتی ہے مسلمان اگر عدل اور اعتدال کی روش کو چھوڑ دے تو وہ انسانوں پر شاہد نہیں رہے گا اور نبیٔ اکرم ﷺ کے قلب اطہر کے لیے غم، دکھ اور جراحت کا سبب بنے گا☆ جس کا قلب حضورﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی سے جتنا روشن ہوگا۔ اسی درجہ وہ معتبر ہوگا☆[١٧]

دورِ حاضر کے ''بالتخلص نعت ساز'' اگر قرآن و حدیث اور کتب سیرت کے غائر مطالعے سے بے توفیق ہیں۔ اگر صحابہ کرام کا نعتیہ آہنگ بھی ان کے سامنے نہیں اور اگر صلحائے اُمت کے رنگِ نعت گوئی تک بھی ان کی رسائی نہیں تو وہ کم از کم درج بالا اقتباسات پر غور فرمائیں بلکہ بار بار غور فرمائیں، روئے رسولﷺ اور خوئے رسولﷺ کی روشنی میں اپنے ظاہر و باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کی طرف مخلصانہ توجہ فرمائیں اور
اللہ پاک سے توصیف و مدحت خیرالبشرﷺ کی دعا مانگیں، توفیق ارزانی ہو اور روح القدس کی تائید شریکِ خامہ محسوس ہو تو قلم اٹھائیں، ورنہ سکوت ہی کو تکلم بلیغ سمجھیں:

ڈوبا ہوا سکوت میں ہے جوش آرزو
اب تو یہی زباں مرے مدعا کی ہے

آخر آج کتنے ہیں جن کے دل کی دھڑکنیں، روح کی لرزشیں اور نگاہوں کی تمنائیں، نعت سرائی سے پہلے، یوں قلم کی نوک پر لو دیتی ہیں کہ:

ذکر اس نورِ مجسمﷺ کا ہے کرنا مقصود
مالک لوح و قلم تو مرے لفظوں کو اجال

☆

قلم خوش بو کا ہو اور اس سے دل پر روشنی لکھوں
مجھے توفیق دے یارب کہ میں نعت نبیؐ لکھوں

اب ثنائے رسولﷺ کے بارے میں جناب کشفی کے بکھرے ہوئے خیالات کو اور جابجا دی گئی ہدایات کو ایک انشائی ترتیب کے ساتھ یک جا کرنے کی سعی کررہا ہوں ان کی بکھری ہوئی عالمانہ اور عارفانہ تحریروں میں، بارگاہ ناز کے راز بھی ہیں اور نوائے سوز و ساز بھی، تمناؤں کے خاکے بھی ہیں اور شعر و ادب کے سلسلے بھی، الغرض:

کچھ حقائق، کچھ معارف، کچھ لطائف، کچھ نکات
اس طرح بکھرے پڑے ہیں جیسے تاروں کی برات

ان جیسا ذوق نگارش اور طرز بدیع، اس دور کم سواد میں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ ان کا قلم ندرت افکار کے جوہر دکھاتا اور دانش و حکمت کی راہوں کو سجاتا چلا جاتا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر فی الواقع روح مہکتی اور درد چہکتا ہے۔ ان کے الفاظ کا جمال اور مطالب کا جلال براہِ راست روح کے تاروں کو چھیڑتا ہے اور یہ تاثر نتیجہ ہے اطاعتِ رسولﷺ کے گرد گھومتی ہوئی محبت کا۔ جناب حفیظ تائب کا یہ شعر

میرے خیال کا مؤید ہے:

تعجب کیا جو میرے لفظ لو دینے لگیں
خیالوں میں ہمیشہ گنبدِ اخضر چمکتا ہے

حسن کہیں بھی ہو، کسی رنگ اور آہنگ میں ہو وہ تحسین کا مستحق ہے اور یہ تحسین بہر نوع حسن آفرین تک پہنچتی ہے۔ رسول پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس و اجمل اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین اور حسین ترین شاہکار ہے۔ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد تفضیل و مبالغے کا ہر صیغہ انھی ﷺ کے لیے ہے، انھی ﷺ کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور انھی ﷺ کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، وہ اٹھتے تھے تو پہاڑ سربلندی پاتے تھے، وہ بیٹھتے تھے تو ستارے، فرش بن جاتے تھے، وہ مسکراتے تھے تو چمنستان کونین کی کلیاں چٹک اُٹھتی تھیں، وہ بولتے تھے تو فضائیں عنبریں ہوجاتی تھیں، وہ پرواز کرتے تھے تو کائنات تھم جاتی تھی، وہ چلتے تھے تو خوش بو بکھر جاتی، راستے جھوم اٹھتے اور تاریخ انسانی مرتب ہوتی چلی جاتی تھی، نتیجہ معلوم کہ وہ ذات بلند و برتر بھی اس کی توصیف میں مصروف رہتی ہے جس تک خود ہر تعریف پہنچتی ہے کسی جمیل وجلیل شاہ کار کو دیکھ کر بے ساختہ حرف تحسین کا زبان پر آجانا اور جذبۂ تحسین کا دل میں اُبھرنا، حمد ہے، جب کہ حضور ﷺ محمد ﷺ اور احمد ﷺ ہیں اور مقامِ محمود پر فائز، اس اعتبار سے آپ ﷺ کا مقام بھی وجہ حمد و ستائش ہے اور آپ ﷺ کی ذات بھی وجہ حمد اور مستحق ستائش گویا آپ ﷺ نے اپنے خالق کی ستائش کا بھی حق ادا کر دیا اور آپ ﷺ کی ستائش بحکم خالق جاری و ساری ہے، یوں آپ ﷺ سزا وار حمد ہیں۔ لیکن اسی ذاتِ پاک ﷺ نے ہمیں یہی پہلا سبق دیا کہ خالق کے برابر مخلوق کو کسی اعتبار سے بھی لے آنا، توہین کی وہ نوعیت ہے جسے شرک کہتے ہیں۔ اور یہی ظلم عظیم ہے۔ چناں چہ ہمیں مجبوراً اور احتراماً تعریف و توصیف کی درجہ بندی کرنا پڑی کہ حمد صرف اللہ تعالیٰ کی، جو بے حد و بے حساب اور وسیع و بیکراں نوعیت کی ہوگی، نعت، صرف محمد ﷺ کی جس کی حد بندی ہے کہ کہیں یہ لامحدود ہوکر، حمد نہ بن جائے اور احد اور احمد کا فرق باقی نہ رہے۔ پھر منقبت ہر اس بابرکت وجود کے لیے جو علم و عمل، خبر و نظر اور گفتار و رفتار کے اعتبار سے سنت رسول ﷺ کا عکس بننے کی مخلصانہ سعی کرتا ہو۔ نعت اور حمد کے باہمی تعلق کو جناب کشفی ایک مقام پر یوں واضح کرتے ہیں... نبیٔ کریم ﷺ کی معرفت تصوف اور تزکیۂ نفس کا پہلا مرحلہ بھی ہے اور آخری بھی، مقام محمدی ﷺ کی طرف سفر کرنے والوں کو نفسِ مطمئنہ اور زبان حمد عطا کی جاتی ہے۔ حمد کی شایاں وہی ذات ہے جو حسن و تناسب کا آخری نقطہ ہو اور جس کی ذات کے ساتھ اس کی صفات بھی شاہکار جمال و توازن و تناسب ہوں۔ اللہ کی یہ صفات اس کارگہِ جمال و جلال میں ہرسُو منعکس ہیں۔ یوں حمد کی سزاوار ذات اپنا اظہار اس سطح پر کرتی ہے کہ اس کے اختیاری محاسن کی جھلکیاں ہمیں بے ساختہ حمد کرنے پر مجبور کردیتی ہیں اور اس عمل

میرے خیال کا مؤید ہے:

تعجب کیا جو میرے لفظ لو دینے لگیں
خیالوں میں ہمیشہ گنبدِ اخضر چمکتا ہے

حسن کہیں بھی ہو، کسی رنگ اور آہنگ میں ہو وہ تحسین کا مستحق ہے اور یہ تحسین بہر نوع حسن آفرین تک پہنچتی ہے۔ رسول پاک ﷺ کی ذاتِ اقدس و اجمل اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین اور حسین ترین شاہکار ہے۔ ایک بہترین نمونہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے بعد تفضیل و مبالغے کا ہر صیغہ انھی ﷺ کے لیے ہے، انھی ﷺ کی اطاعت، اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور انھی ﷺ کی محبت، اللہ تعالیٰ کی محبت ہے، وہ اٹھتے تھے تو پہاڑ سر بلندی پاتے تھے، وہ بیٹھتے تھے تو ستارے، فرش بن جاتے تھے، وہ مسکراتے تھے تو چمنستان کونین کی کلیاں چٹک اُٹھتی تھیں، وہ بولتے تھے تو فضائیں عنبریں ہوجاتی تھیں، وہ پرواز کرتے تھے تو کائنات تھم جاتی تھی، وہ چلتے تھے تو خوش بو بکھر جاتی، راستے جھوم اٹھتے اور تاریخ انسانی مرتب ہوتی چلی جاتی تھی، نتیجہ معلوم کہ وہ ذات بلند و برتر بھی اس کی توصیف میں مصروف رہتی ہے جس تک خود ہر تعریف پہنچتی ہے کسی جمیل وجلیل شاہ کار کو دیکھ کر بے ساختہ حرف تحسین کا زبان پر آجانا اور جذبۂ تحسین کا دل میں اُبھرنا، حمد ہے، جب کہ حضور ﷺ محمد ﷺ اور احمد ﷺ ہیں اور مقامِ محمود پر فائز، اس اعتبار سے آپ ﷺ کا مقام بھی وجہ حمد و ستائش ہے اور آپ ﷺ کی ذات بھی وجہ حمد اور مستحق ستائش گویا آپ ﷺ نے اپنے خالق کی ستائش کا بھی حق ادا کر دیا اور آپ ﷺ کی ستائش بحکم خالق جاری و ساری ہے، یوں آپ ﷺ سزا وار حمد ہیں۔ لیکن اسی ذاتِ پاک ﷺ نے ہمیں یہی پہلا سبق دیا کہ خالق کے برابر مخلوق کو کسی اعتبار سے بھی لے آنا، توہین کی وہ نوعیت ہے جسے شرک کہتے ہیں۔ اور یہی ظلمِ عظیم ہے۔ چناں چہ ہمیں مجبوراً اور احتراماً تعریف و توصیف کی درجہ بندی کرنا پڑی کہ حمد صرف اللہ تعالیٰ کی، جو بے حد و بے حساب اور وسیع و بیکراں نوعیت کی ہوگی، نعت، صرف محمد ﷺ کی جس کی حد بندی ہے کہ کہیں یہ لامحدود ہوکر، حمد نہ بن جائے اور احد اور احمد کا فرق باقی نہ رہے۔ پھر منقبت ہر اس بابرکت وجود کے لیے جو علم وعمل، خبر ونظر اور گفتار و رفتار کے اعتبار سے سنت رسول ﷺ کا عکس بننے کی مخلصانہ سعی کرتا ہو۔ نعت اور حمد کے باہمی تعلق کو جناب کشفی ایک مقام پر یوں واضح کرتے ہیں... نبیٔ کریم ﷺ کی معرفت تصوف اور تزکیۂ نفس کا پہلا مرحلہ بھی ہے اور آخری بھی، مقام محمدی ﷺ کی طرف سفر کرنے والوں کو نفسِ مطمئنہ اور زبان حمد عطا کی جاتی ہے۔ حمد کی شایاں وہی ذات ہے جو حسن و تناسب کا آخری نقطہ ہو اور جس کی ذات کے ساتھ اس کی صفات بھی شاہکار جمال و توازن و تناسب ہوں۔ اللہ کی یہ صفات اس کارگہِ جمال و جلال میں ہرسُو منعکس ہیں۔ یوں حمد کی سزاوار ذات اپنا اظہار اس سطح پر کرتی ہے کہ اس کے اختیاری محاسن کی جھلکیاں ہمیں بے ساختہ حمد کرنے پر مجبور کردیتی ہیں اور اس عمل میں ہمارا سارا وجود شامل ہوتا ہے۔ حمد کے لیے لازم ہے کہ جس ذات کی حمد کی جارہی ہو اس کی صفات اور کمالات کا پوری طرح ادراک اور علم ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک وعلم حضرت رسول کریم علیہ الصلوۃ والسلام کی ذاتِ گرامی کے طفیل ہمیں نصیب ہوا وہ رسول جو ''احمد'' تھا اور بے حد حمد کرنے کا عمل جس کا اسم صفاتی ٹھہرا، وہ رسول ﷺ جو ''محمد'' ﷺ تھا۔ اس نے اس درجہ اپنے منبع و مصدر کی حمد کی کہ خود ''وجۂ حمد وستائش'' بن گیا۔ وہ رسول جو مقام محمود پر ابداً فائز ہے۔ یہ وہ مقام ہے کہ حزن وخوف اس کے جوار میں قدم نہیں رکھ سکتے اور یہی وہ مقام ہے جو دوسروں کے لیے باعث سکون وقرار بنتا ہے یہی وہ مقام ہے کہ جہاں پہنچ کر ذات رسالت مآب ﷺ ہمارے لیے حصار حفاظت بن گئی ہے۔☆[18]

اب جناب کشفی کے دوشعر:

احمد ﷺ تھا اور خالق اکبر کا شاہکار
حامد ﷺ تھا اور حمد کو گہرائی دے گیا

☆

نغمۂ احمد ﷺ مرسل ہے مقدر اپنا
ہر صداقت ہے اسی ایک صدا میں شامل

جناب کشفی نے اپنے مختصر مگر انتہائی معتبر نعتیہ مجموعے ''نسبت'' کے حرفِ آغاز کے طور پر جو چند سطور لکھ دی ہیں۔ میرے خیال میں نعت کے بارے میں ان کی سوچ کا ہر زاویۂ فکر کا ہر انداز اور وجدان کا ہر رخ، ان میں سمٹ گیا ہے۔ یوں سمجھیے کہ وہ نثر میں تغزل کے ایمائی انداز کے ساتھ بہت کچھ کہہ گئے ہیں۔ ان کے خیال میں نعت، خدا کے بعد حضور ﷺ کو عزیز ترین سمجھ کر، ان ﷺ کے نقوش پا کی چاندنی سے قلب ونظر اور روز وشب کی ظلمتوں کو اجالنے کا نام ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور ﷺ کو عزیز ترین کہہ دینا جتنا آسان ہے اتنا دُشوار بھی ہے اور یہ دشواریاں نگہ ناز کے تلطف خاص ہی سے آسانیوں میں بدل سکتی ہیں۔ نعت قلمی حاضری کا نہیں بلکہ قلبی حضوری کا عکس جمیل ہے۔ اور حضوری دور رہ کر بھی قرب کے لمحے عطا کیا کرتی ہے اور غافل انسان نہ صاحب حضور ہوتے ہیں نہ صاحب سرور، وہ قریب رہ کر بھی دور ہوتے ہیں اور یاد رہے کہ سرور، حضوری ہی کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے اور اگر ان لمحات سرور میں کائنات تھمی ہوئی سی، گردش ایام رکی ہوئی سی اور دل کی دھڑکنیں، پلکوں کی نمی میں ڈھلی ہوئی سی محسوس ہوں تو یہ بے سجدہ و قیام نوعیت کی ایک ایسی ''نماز نیاز'' ہے جس پر کئی نعتیہ دیوان رشک کرسکتے ہیں۔ نعت گوئی کی توفیق سراسر عطائے محبوب ہے۔ اپنا کوئی سا فخر بھی نہیں ہے۔ خیال کا گداز بھی، لفظوں کا حسن بھی، اظہار کا تقدس بھی، لرزتے لبوں کا سکوت بھی اور سرمژگاں کانپتے ہوئے ستارے بھی، بڑے ہی نصیب کی باتیں ہیں اور بڑے ہی کرم کے فیصلے ہیں:

التفات سیّد سادات کب محدود ہے
وسعت دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے

گویا...نعت گوئی، اپنی جان کی قیمت پر سرور دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے...ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف وصوت کی دنیا میں کبھی مل جائے، نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں نعت گوئی اس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم، رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار، نعت دل زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے:

نگاہے یارسولؐ اللہ نگاہے ☆[19]

قلب ونظر اور جسم و جاں کی ہم آہنگی کا یہی وہ قیمتی لمحہ ہے جب انسان خود کو بھول جاتا ہے اور ''کیا ہوں میں'' کی فرصت کاوش باقی نہیں رہتی۔ یوں حیات مستعار کا ہر غم، ایک ہی غم میں ضم ہوجاتا ہے اور آسودگیٔ خاطر کے لیے احوال شعری پیکر میں ڈھل کر شاعر کے ساتھ ساتھ قاری اور سامع کے لیے بھی نشاط روح کا سبب ہوجاتے ہیں۔ یوں نعت انفرادیت کے خول سے نکل کر اجتماعیت کے ایک وسیع تر دائرے میں آ کر سوز ودرد کی نعمت بانٹتی چلی جاتی ہے گویا...نعت فرد کا نغمۂ تنہائی اور استغاثۂ شخصی بھی ہے اور ایک مسلم معاشرہ میں ایک اجتماعی سرگرمی اور تقریبوں کی اساس بھی۔☆[20]

نعت، توصیف رسالت مآب ﷺ ہے، ضروری نہیں کہ یہ توصیف شعر ہی میں ہو۔ عربوں کے نزدیک تو شعر نام ہی کلام موزوں کا ہے۔ خوب صورت خیال کو دل آویز لفظوں میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ارفع خیال کو اجمل پیرایۂ اظہار فطری طور پر مل جاتا ہے۔ جناب انور جمال نے درست لکھا ہے کہ ''جذبے کی شدت لفظوں کو خود حسن ترتیب دے دیتی ہے۔ جذبہ فن کا پیش رو ہے، جذبے کی صداقت فن کی ارفعیت کو جنم دیتی ہے'' اور وہ یہ بات مدینہ کی بچیوں کے اس موزوں کلام سے اخذ کرتے ہیں جو ہجرت کے اختتام پر روئے رسول اکرم ﷺ کی اوّلین جھلک دیکھنے کی آرزو میں پڑھا جارہا تھا وہ حیران اس امر پر ہیں کہ ان معصوم بچیوں کو پہلے عروض و اوزان سکھائے گئے تھے، شعر رٹائے گئے تھے یا جذبے کی صداقت خود بخود موزونیت کی میزان میں تل گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ہی کا حسن ہے جس کی بنا پر بعض موزوں نثری جملے سن کر شعر بھی شرما جاتے ہیں۔ بعض نثری تحریریں اس قدر سحر آفریں ہوتی ہیں کہ وہ قارئین کو ایسا شعری کیف دے جاتی ہیں کہ ذوقِ سلیم مدتوں مسحور لذت رہ سکتا ہے۔ چودھری افضل حق کی محبوب خدا ﷺ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم ﷺ'' اور گئے گزرے دور میں مولانا ظفر علی خاں، آغا شورش کاشمیری اور جناب عامر عثمانی کی سیرت سے متعلق بعض تحریریں

التفات سیّد سادات کب محدود ہے
وسعت دامن بھی دیتے ہیں عطا کرتے ہوئے

گویا...نعت گوئی، اپنی جان کی قیمت پر سرور دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے...ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف وصوت کی دنیا میں کبھی مل جائے، نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چند لمحوں کا نام ہے جو وقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں نعت گوئی اس انتظار کا نام ہے جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم، رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار، نعت دل زندہ کے ساتھ بیداری کی ساعت کا نام ہے:

نگا ہے یارسولؐ اللہ نگا ہے ☆[19]

قلب ونظر اور جسم و جاں کی ہم آہنگی کا یہی وہ قیمتی لمحہ ہے جب انسان خود کو بھول جاتا ہے اور ''کیا ہوں میں'' کی فرصت کاوش باقی نہیں رہتی۔ یوں حیات مستعار کا ہر غم، ایک ہی غم میں ضم ہوجاتا ہے اور آسودگیٔ خاطر کے لیے احوال شعری پیکر میں ڈھل کر شاعر کے ساتھ ساتھ قاری اور سامع کے لیے بھی نشاط روح کا سبب ہوجاتے ہیں۔ یوں نعت انفرادیت کے خول سے نکل کر اجتماعیت کے ایک وسیع تر دائرے میں آ کر سوز ودرد کی نعمت بانٹتی چلی جاتی ہے گویا...نعت فرد کا نغمۂ تنہائی اور استغاثۂ شخصی بھی ہے اور ایک مسلم معاشرہ میں ایک اجتماعی سرگرمی اور تقریبوں کی اساس بھی۔ ☆[20]

نعت، توصیف رسالت مآب ﷺ ہے، ضروری نہیں کہ یہ توصیف شعر ہی میں ہو۔ عربوں کے نزدیک تو شعر نام ہی کلام موزوں کا ہے۔ خوب صورت خیال کو دل آویز لفظوں میں ڈھلا ہوا ہونا چاہیے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک ارفع خیال کو اجمل پیرایۂ اظہار فطری طور پر مل جاتا ہے۔ جناب انور جمال نے درست لکھا ہے کہ ''جذبے کی شدت لفظوں کو خود حسن ترتیب دے دیتی ہے۔ جذبہ فن کا پیش رو ہے، جذبے کی صداقت فن کی ارفعیت کو جنم دیتی ہے'' اور وہ یہ بات مدینہ کی بچیوں کے اس موزوں کلام سے اخذ کرتے ہیں جو ہجرت کے اختتام پر روئے رسول اکرم ﷺ کی اوّلین جھلک دیکھنے کی آرزو میں پڑھا جارہا تھا وہ حیران اس امر پر ہیں کہ ان معصوم بچیوں کو پہلے عروض و اوزان سکھائے گئے تھے، شعر رٹائے گئے تھے یا جذبے کی صداقت خود بخود موزونیت کی میزان میں تل گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات ہی کا حسن ہے جس کی بنا پر بعض موزوں نثری جملے سن کر شعر بھی شرما جاتے ہیں۔ بعض نثری تحریریں اس قدر سحر آفریں ہوتی ہیں کہ وہ قارئین کو ایسا شعری کیف دے جاتی ہیں کہ ذوقِ سلیم مدتوں مسحور لذت رہ سکتا ہے۔ چودھری افضل حق کی محبوب خدا ﷺ اور مولانا مناظر احسن گیلانی کی ''النبی الخاتم ﷺ'' اور گئے گزرے دور میں مولانا ظفر علی خاں، آغا شورش کاشمیری اور جناب عامر عثمانی کی سیرت سے متعلق بعض تحریریں نثری نعتوں کی حیثیت رکھتی ہیں، گویا یہ جذبے ہی کی صداقت ہے جس کے سبب پیرایۂ اظہار کے یہ سبھی مناظر، احسن بن گئے ہیں، مولانا ابوالخیر کشفی نے ایک مقام پر شبلی نعمانی کے اس ایک صفحے کو جو ظہور قدسی سے متعلق ہے اور خواجہ حسن نظامی کی بعض تحریروں کو بہترین نعتیں قرار دیا ہے۔ گویا حضور ﷺ سے متعلق تحریر میں جب ''عشق، خیال اور فن تینوں اجزا مل کر ایک وحدت کی صورت اختیار کرجائیں'' تو اسے ہم نعت ہی کے حسن سے تعبیر کریں گے۔ نعت ایک ایسی دل آویز اور دل نواز صنفِ سخن ہے جو خود خیال کو رعنائی، لفظ کو زیبائی اور انداز کو توانائی عطا کرتی ہے کیوں کہ اس کی اساس فرضی نہیں بلکہ اس حقیقی محبت پر استوار ہے جس پر ایمان کا ایوان ایستادہ ہے اور ''یہی محبت، لفظوں میں ایک کیمیاوی تغیر برپا کرتی ہے کہ محبت اپنی کیمیا آپ ہے'' احسان دانش کہاں یاد آگئے، کہتے ہیں:

وفا کا سوز تو کندن بنا دیتا ہے انساں کو
محبت جس کو خاکستر کرے گی کیمیا ہوگا

'نعت سازی' آسان ہے کہ ''باتخلص'' حضرات تلوار کی دھار پر ''بے خوف وخطر'' چلے جا رہے ہیں، نعتیہ دیوانوں کے ڈھیر لگتے چلے جارہے ہیں کہ دور نعت کا ہے اس لیے نعتیں تو لکھنی چاہئیں مگر ''نعت گوئی'' کہیں مشکل امر ہے کہ اس میدان میں بڑے بڑے قادرالکلام عاجز نظر آتے ہیں، ماضی بعید میں بہت سے نفوس قدسیہ ایسے نظر آتے ہیں جو حب رسول ﷺ کے ساتھ ساتھ شعر گوئی کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھے، مگر وہ چند ایک نعتوں سے آگے نہ جاسکے کہ کہیں کسی لفظ سے عمر بھر کی بنی، بگڑ نہ جائے، آج کتنے ہیں کہ نعت کہنے کی کوشش میں جن کی جبینوں پر پسینا چمکتا اور جن کے ہاتھوں میں قلم لرزتا ہے کون سمجھائے کہ ''حسرت نعت'' بھی ایک عظیم نعت ہوا کرتی ہے:

پہلے صلاحیت تو ہو پیدا مرے کردار میں!
نذرانہ لے کر نعت کاتب جاؤں اس دربار میں

...نعت گوئی اگر شمشیر کی دھار پر سفر ہے تو حضور ﷺ سے خطاب، حرف و بیان کے اس پل صراط سے گزرنا ہے جس کے نتیجے میں آنے والے پل صراط کے سفر کی کیفیت کا تعین ہوگا۔ ☆[21]

جب تک نعت گو، اطاعت وحب رسول ﷺ کے سلسلے میں خودسپردگی اور بے خودی کی دنیا میں نہ پہنچ جائے اس وقت تک اس کے فن میں تاثر نہیں آسکتا، مایہ کہ آج بیش تر نعتیں، نعت نمبروں میں محض شمولیت کی خاطر لکھی جارہی ہیں، بعض اوقات طرحی نعتیہ مشاعروں میں سنانے کے لیے مجبوراً نعت کہی جارہی ہے، بیشتر نعتیں، برائے بیت لکھی جارہی ہیں، صرف دنیاوی محفلوں میں سنانے کے لیے اور دنیا ہی سے ''واہ واہ'' سننے کے لیے، ایسی نعت مدتوں کے بعد وجود میں آتی ہے جو انھیں سنائی جاتی ہے، جن کے لیے لکھی جاتی ہے، تب دُنیا کو سنانے کی حاجت رہتی ہے نہ آرزو بلکہ اہل دل، خود وہ نعت سننے کے لیے بے چین

ہوا کرتے ہیں۔ جب چاہنے والا خود کو محبوب کی چاہت میں گم کر دیتا ہے تو اس کی پکار اور فریاد کا مخاطب محبوب ہی ہوا کرتا ہے۔ نعت یقیناً حضور ﷺ ہی کے لیے لکھی جاتی ہے مگر انھیں سنائی بھی جاتی یا نہیں؟ افسوس کہ بیشتر نعتیہ مجموعے اور ان کی تقاریبِ رونمائی محض شوکت نفس اور اہتزازِ ذات کے مظاہرے ہیں یاد رہے کہ ''میں'' کی دنیا ہمیشہ ''تو'' سے محروم رہا کرتی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ نعتیہ مشاعروں کی تصویر کشی ارادتاً کرائی جاتی اور چھپوائی جاتی ہے جب کہ تصویر کو حضور ﷺ کی پسندیدگی کی سند حاصل نہیں ہے کیا یہ سچ نہیں کہ 'حی علی الصلوٰۃ'' کے بلاوے پر لبیک صرف اس لیے نہیں کہی جاتی کہ اس سے مشاعروں کا تسلسل ٹوٹتا اور مجمع بکھرتا ہے (مستثنیات ہر مقام پر ہوتی ہیں مگر حکم ہمیشہ اکثریت پر لگا کرتا ہے) اس دور نعت گوئی میں کثرت نعت گوئی کی قباحتوں کو نقد ونظر کے کڑے پیمانوں کے ذریعے قابو میں رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ لازم ہے کہ... حضور ﷺ کی ذات کے مہر درخشاں کے حضور میں نعت گو، اپنے آپ کو یوں رکھ دے کہ یہ قطرہ اپنا وجود کھو بیٹھے کہ یہی عشرت قطرہ ہے۔ اپنی ذات کو گم کیے بغیر نعت نہیں کہی جاسکتی۔ نعت کے سلسلے میں جن شعراء کے ہاں تعلّی نظر آتی ہے اپنے شاعرانہ مرتبہ کا اظہار نظر آتا ہے وہ میرے نزدیک کچھ ایسا محمود وقت نہیں ہوتا، زندگیٔ جاوید اسی ہنگام اور لمحہ سے عبارت ہے جس لمحہ شاعر اور حضور ﷺ کے درمیان عبد اور آقا کا رشتہ ہو بلکہ غلام غلامان محمد ﷺ کا حلقۂ غلامی اپنی گردن میں ڈالنے کو جی چاہے۔☆۲۲

نعت گوئی ارادت ومحبت ہی کا نہیں، شکر و سپاس کا بھی ایک شعری اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور ان کی تعلیمات کی شکل میں ہمیں دنیاوی اور اخروی زندگی کی سرخ روئی کے سلیقے اور قرینے عطا فرمائے۔ اگر نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت نہ ہوتی تو ہمارے جسم و جاں کا ہر لمحہ دھواں دھواں ہوتا۔ کیوں کہ وہی ایک محفل، تجلّی کی روشن سحر ہے اور وہیں سے نور وحضور کی کرنیں پھوٹتی ہیں، اس طرح نعت گوئی درود و سلام کی ایک نغماتی شکل بھی ہے اور ''نماز نیاز'' کی ایک دل آویز صورت بھی۔ صوری طور پر نعت ایک شعری سانچا ہے مگر معنوی اعتبار سے عبادت کا آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے لیے سچے ادراک اور گہرے عرفان کی ضرورت ہے۔ جناب محسن احسان کے الفاظ میں ''نعت میں نہ عبارت آرائی کام آتی ہے نہ مضمون آفرینی اور نہ ہی نری عقیدت اور تنہا وفور محبت، اس صنف میں کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ محمد ﷺ کی ذات وصفات کا صحیح عرفان حاصل ہو۔ اس کی عظمت و رفعت کا گہرا نقش لوح دل پر ثبت ہو اور جو کچھ وہ کہے وہ کسی لمحے کی ترنگ یا خیال کی امنگ میں نہ کہے بلکہ اپنے تمام تر فکری سرمائے اور قلبی جذبات کے رنگ میں ڈوب کر، اعتراف عظمت اور شکرانۂ نعمت کے طور پر علم وعمل کی گواہی کے ساتھ کہے'' گویا... رسول پاک ﷺ مومنوں پر اللہ کا سب سے بڑا احسان ہیں۔ اس کے سوا کسی اور احسان کا قرآن حکیم میں تذکرہ نہیں ملتا۔ یوں نعت گوئی میں دراصل بندگی کا پہلو بھی ہے اور اظہار بھی۔ مومن اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نبیٔ کریم ﷺ کی صورت میں ہمیں سلیقۂ زیست اور زندگی گزارنے

ہوا کرتے ہیں۔ جب چاہنے والا خود کو محبوب کی چاہت میں گم کر دیتا ہے تو اس کی پکار اور فریاد کا مخاطب محبوب ہی ہوا کرتا ہے۔ نعت یقیناً حضور ﷺ ہی کے لیے لکھی جاتی ہے مگر انھیں سنائی بھی جاتی یا نہیں؟ افسوس کہ بیشتر نعتیہ مجموعے اور ان کی تقاریبِ رونمائی محض شوکت نفس اور اہتزاز ذات کے مظاہرے ہیں یاد رہے کہ ''میں'' کی دنیا ہمیشہ ''تو'' سے محروم رہا کرتی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ نعتیہ مشاعروں کی تصویر کشی ارادتاً کرائی جاتی اور چھپوائی جاتی ہے جب کہ تصویر کو حضور ﷺ کی پسندیدگی کی سند حاصل نہیں ہے کیا یہ سچ نہیں کہ 'حی علی الصلوٰۃ'' کے بلاوے پر لبیک صرف اس لیے نہیں کہی جاتی کہ اس سے مشاعروں کا تسلسل ٹوٹتا اور مجمع بکھرتا ہے (مستثنیات ہر مقام پر ہوتی ہیں مگر حکم ہمیشہ اکثریت پر لگا کرتا ہے) اس دور نعت گوئی میں کثرت نعت گوئی کی قباحتوں کو نقد و نظر کے کڑے پیمانوں کے ذریعے قابو میں رکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ لازم ہے کہ... حضور ﷺ کی ذات کے مہر درخشاں کے حضور میں نعت گو، اپنے آپ کو یوں رکھ دے کہ یہ قطرہ اپنا وجود کھو بیٹھے کہ یہی عشرت قطرہ ہے۔ اپنی ذات کو گم کیے بغیر نعت نہیں کہی جا سکتی۔ نعت کے سلسلے میں جن شعراء کے ہاں تعلّی نظر آتی ہے اپنے شاعرانہ مرتبہ کا اظہار نظر آتا ہے وہ میرے نزدیک کچھ ایسا محمود وقت نہیں ہوتا، زندگیٔ جاوید اسی ہنگام اور لمحہ سے عبارت ہے جس لمحہ شاعر اور حضور ﷺ کے درمیان عبد اور آقا کا رشتہ ہو بلکہ غلام غلامان محمد ﷺ کا حلقۂ غلامی اپنی گردن میں ڈالنے کو جی چاہے۔☆[22]

نعت گوئی ارادت و محبت ہی کا نہیں، شکر و سپاس کا بھی ایک شعری اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ اور ان کی تعلیمات کی شکل میں ہمیں دنیاوی اور اخروی زندگی کی سرخ روئی کے سلیقے اور قرینے عطا فرمائے۔ اگر نبیٔ اکرم ﷺ کی بعثت نہ ہوتی تو ہمارے جسم و جاں کا ہر لمحہ دھواں دھواں ہوتا۔ کیوں کہ وہی ایک محفل، تجلّی کی روشن سحر ہے اور وہیں سے نور و حضور کی کرنیں پھوٹتی ہیں، اس طرح نعت گوئی درود و سلام کی ایک نغماتی شکل بھی ہے اور ''نماز نیاز'' کی ایک دل آویز صورت بھی۔ صوری طور پر نعت ایک شعری سانچا ہے مگر معنوی اعتبار سے عبادت کا آہنگ لیے ہوئے ہے۔ اس کے لیے سچے ادراک اور گہرے عرفان کی ضرورت ہے۔ جناب محسن احسان کے الفاظ میں ''نعت میں نہ عبارت آرائی کام آتی ہے نہ مضمون آفرینی اور نہ ہی نری عقیدت اور تنہا وفور محبت، اس صنف میں کامیابی کی اوّلین شرط یہ ہے کہ محمد ﷺ کی ذات و صفات کا صحیح عرفان حاصل ہو۔ اس کی عظمت و رفعت کا گہرا نقش لوح دل پر ثبت ہو اور جو کچھ وہ کہے وہ کسی لمحے کی ترنگ یا خیال کی امنگ میں نہ کہے بلکہ اپنے تمام تر فکری سرمائے اور قلبی جذبات کے رنگ میں ڈوب کر، اعتراف عظمت اور شکرانۂ نعمت کے طور پر علم و عمل کی گواہی کے ساتھ کہے'' گویا... رسول پاک ﷺ مومنوں پر اللہ کا سب سے بڑا احسان ہیں۔ اس کے سوا کسی اور احسان کا قرآن حکیم میں تذکرہ نہیں ملتا۔ یوں نعت گوئی میں دراصل بندگی کا پہلو بھی ہے اور اظہار بھی۔ مومن اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے نبیٔ کریم ﷺ کی صورت میں ہمیں سلیقۂ زیست اور زندگی گزارنے کا سہارا عطا کر دیا۔☆[23]

نعت گوئی کی صلاحیت، اللہ تعالیٰ کی عطا اور نبیٔ کریم ﷺ کی رضا پر منحصر ہے اور حق یہ ہے کہ یہ عطا اور یہ رضا فیض اور فیضان کے بے کراں سلسلے ہیں۔ فیض میں لبالب ہو کر بہہ نکلنے کا مفہوم پایا جاتا ہے اور فیض مستحق تک بخوبی پہنچ جائے تو اسے ''فیضان'' کہتے ہیں جب کہ فیاضی سے مراد یہ ہے کہ دینے والا اتنا دے دے کہ دامن کی کوتاہی کا احساس شدید تر ہو جائے، گویا لطف جمال کے منتہائے کمال پر پہنچ کر نوازنے کا دوسرا نام فیض اور فیضان ہے۔ حب رسول ﷺ اور توصیف رسول ﷺ اسی توفیق و نوازش کا دل آویز ثمر ہیں:

شعر و ادب بھی، آہ و فغاں بھی ہے ان کا فیض
پیش حضور، اپنی متاع ہنر کریں

اگر قدح خوار کم ظرف ہے تو جام اس تک آیا ہی نہیں کرتا اور ساقی کا تلطف جسے نوازتا ہے وہ فی الواقع خاصان بارگاہ میں سے ہوتا ہے:

دہد حق عشق احمد بندگان چیدہ خود را
بہ خاصاں می دہدشہ، بادۂ نوشیدہ خود را

نعت گوئی، فن شعر کی معراج ہے ذوق شعر کو درست سمت کا مل جانا اور فکری صلاحیت کو صالحیت کا نصیب ہو جانا، خوبیٔ قسمت کی بات ہے اور جس دربار سے لطف و کرم کے یہ فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ اس کے بارے میں ''غلط بخشی'' کا تصور بھی آدمی کو ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کو حضور ﷺ کی وساطت سے جانا، مانا اور پہچانا، ہم نے نہ طور پر تجلّیوں کی بارش دیکھی، نہ نخل طور کو دمکتا پایا اور نہ کوہ سینا کو جھکتے اور گرتے دیکھا۔ بس ایک زبان صدق اظہار نے اس سب سے بڑی صداقت کا پتا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان ﷺ کے حوالے کے بغیر ان ﷺ کے رب کی حمد، ایک بے روح لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حوالے بغیر نعت، جناب کشفی کے نزدیک ''سیکولر نوعیت کی نعت'' ہے وہ ایک مقام پر اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کرتے ہیں... ہمارے عہد میں رسمی نعتوں کے علاوہ سیکولر نعتوں کا بھی فیشن ہے۔ اللہ تعالیٰ سے منہ موڑ کر رسول کریم ﷺ کی عظمتوں کی ''دریافت'' اور تذکرہ یہ ویسی ہی کوشش ہے جیسے مصوتہ VOWFI کے بغیر گفتگو کرنے کی کوشش، ایسے نعت گو، رسول پاک ﷺ کا ذکر بھی اسی طرح کرتے ہیں جیسے دوسرے رہنماؤں اور مصلحوں کا ذکر، یہ اس پیمانے اور اسکیل سے بے خبر ہیں جس سے ہم رسول پاک ﷺ کی عظمت کا کسی قدر اندازہ کر سکتے ہیں کوئی بھی رسول بالعموم اور نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام بالخصوص رب کائنات کا سب سے بڑا شاہ کار ہیں۔ یہ نظامِ شمسی، یہ کائنات کی پہنائیاں، یہ فضاؤں کی بے کرانیاں، یہ سب ہمارے رسول ﷺ کی عظمت ذات کے

ایک گوشے میں سمٹ کر گم ہوجاتی ہیں۔ یہ وہ ذات ہے جو ہمارے لیے خالق نما بن جاتی ہے اور حمد میں نعت بھی سمٹ آتی ہے۔ سلسلۂ تخلیق کو تو دور بینوں اور سائنسی تجربوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر خالق تک رسول ﷺ کے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ حالاں کہ یہ خالق اپنی ہر تخلیق کے آئینے میں موجود ہے۔ حمد ان جذبات ستائش کا نام ہے جو کسی ایسے حسن اور تناسب کے ناپنے کا حوالہ بن سکے۔ ہم خدا کی ذات کا نظارہ تو نہیں کر سکتے کیوں کہ کوئی آنکھ اس حسن کو نہیں دیکھ سکتی مگر یہ ذات ہر حسن کا حوالہ بن جاتی ہے اور ایسا سب سے بڑا حوالہ محمد عربی ﷺ ہیں۔ یہی وہ تصویر ہے جو ہمیں اس کے مصور کے بارے میں سب سے زیادہ علم عطا کرتی ہے حالاں کہ وہی مصور کائنات کے کینوس پر بے شمار رنگوں کی صورت میں موجود ہے مگر اس کی صفات کے رنگ جتنے اور جس حد تک سرکار ختمی مرتبت ﷺ میں موجود ہیں کہیں اور میں نظر نہیں آتے۔ پھر حمد کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ 'حسن' کی جو تعریف بیان کی جائے وہ تخمینی اور ظنی نہ ہو، بلکہ ہمیں اس کی صحت پر اعتماد اور یقین ہو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف ہم ایمان، یقین، اپنے وجدان اور بصیرت کی استوار بنیادوں پر کرتے ہیں، ہمیں جس طرح اللہ کے خالق کائنات ہونے پر یقین ہے اسی طرح اس بات پر بھی ہے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان سب سے مضبوط وسیلہ اور رشتہ ذاتِ محمد عربی ﷺ ہے اور ان کی صفات میں کمال بھی ہے اور جامعیت بھی۔ وہ ذات حمد کے دائرے کے اندر آجاتی ہے جو حامد بھی ہے احمد بھی اور مقام محمود پر فائز بھی۔☆[۲۴] سیکولر نعتوں سے یاد آیا کہ گزشتہ دنوں ایک ایسا نعت نمبر بھی نظر سے گزرا جس میں نعت گو حضرات کی ۱۵۰ کے لگ بھگ ایسی تصاویر ہیں جن کے چہروں سے واضح نظر آرہا ہے کہ انھیں ممدوح عظیم وجلیل کے چہرۂ مبارک سے کوئی سی نسبت بھی نہیں ہے اور تیرہ بے پردہ خواتین ومستورات کی تصاویر بھی ہیں، تصویر کو کسی نوع سے بھی خوشنودیٔ رسول ﷺ کی سند حاصل نہیں ہے۔ بے پردگی کے بارے میں احکامات واضح ہیں، تاریخی حقیقت ہے کہ ایک جنگ میں طے قبیلے کی ایک لڑکی اسیر ہوکر آئی تھی، وہ بے پردہ تھی، اس غیر مسلم بیٹی کو بے پردہ دیکھ کر حضور ﷺ نے اپنی وہ مبارک ردا جس کا ایک ایک تار ہزاروں رحمتوں اور برکتوں کا خزینہ تھا اس بے پردہ بیٹی کے چہرے پر تان دی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ خوب صورت شعر لکھا تھا:

ما ازاں خاتون طے عریاں تریم

پیش اقوام جہاں بے چادر یم

غور فرمایئے کہ ''نعت کے اس دور میں'' نعت نمبر کیا سے کیا رخ اختیار کر رہے ہیں؟ واضح رہے کہ جسے حضور ﷺ کے حسین چہرے سے محبت ہوگی وہ اپنے چہرے کو بھی اسی انداز سے آراستہ کرنے کی سعی کرے گا۔ سنت رسول ﷺ کو آئینہ سامنے رکھ کر، ہر صبح ذبح کرنا اور خود کو خوب صورت سمجھنا، کسی نوع کی توصیف رسول ﷺ ہے۔ اس ضمن میں نہ کوئی عذر ہے نہ کوئی دلیل، سوائے احساس ندامت اور اعتراف محرومی

ایک گوشے میں سمٹ کر گم ہو جاتی ہیں۔ یہ وہ ذات ہے جو ہمارے لیے خالق نما بن جاتی ہے اور حمد میں نعت بھی سمٹ آتی ہے۔ سلسلۂ تخلیق کو تو دور بینوں اور سائنسی تجربوں سے سمجھا جاسکتا ہے۔ مگر خالق تک رسول ﷺ کے بغیر رسائی ممکن نہیں۔ حالاں کہ یہ خالق اپنی ہر تخلیق کے آئینے میں موجود ہے۔ حمد ان جذبات ستائش کا نام ہے جو کسی ایسے حسن اور تناسب کے ناپنے کا حوالہ بن سکے۔ ہم خدا کی ذات کا نظارہ تو نہیں کرسکتے کیوں کہ کوئی آنکھ اس حسن کو نہیں دیکھ سکتی مگر یہ ذات ہر حسن کا حوالہ بن جاتی ہے اور ایسا سب سے بڑا حوالہ محمد عربی ﷺ ہیں۔ یہی وہ تصویر ہے جو ہمیں اس کے مصور کے بارے میں سب سے زیادہ علم عطا کرتی ہے حالاں کہ وہی مصور کائنات کے کینوس پر بے شمار رنگوں کی صورت میں موجود ہے مگر اس کی صفات کے رنگ جتنے اور جس حد تک سرکار ختمی مرتبت ﷺ میں موجود ہیں کہیں اور میں نظر نہیں آتے۔ پھر حمد کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ 'حسن' کی جو تعریف بیان کی جائے وہ تخمینی اور ظنی نہ ہو، بلکہ ہمیں اس کی صحت پر اعتماد اور یقین ہو، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعریف ہم ایمان، یقین، اپنے وجدان اور بصیرت کی استوار بنیادوں پر کرتے ہیں، ہمیں جس طرح اللہ کے خالق کائنات ہونے پر یقین ہے اسی طرح اس بات پر بھی ہے کہ ہمارے اور اللہ کے درمیان سب سے مضبوط وسیلہ اور رشتہ ذاتِ محمد عربی ﷺ ہے اور ان کی صفات میں کمال بھی ہے اور جامعیت بھی۔ وہ ذات حمد کے دائرے کے اندر آجاتی ہے جو حامد بھی ہے احمد بھی اور مقام محمود پر فائز بھی۔☆[۲۴] سیکولر نعتوں سے یاد آیا کہ گزشتہ دنوں ایک ایسا نعت نمبر بھی نظر سے گزرا جس میں نعت گو حضرات کی ۱۵۰ کے لگ بھگ ایسی تصاویر ہیں جن کے چہروں سے واضح نظر آرہا ہے کہ انھیں ممدوح عظیم وجلیل کے چہرۂ مبارک سے کوئی سی نسبت بھی نہیں ہے اور تیرہ بے پردہ خواتین و مستورات کی تصاویر بھی ہیں، تصویر کو کسی نوع سے بھی خوشنودیٔ رسول ﷺ کی سند حاصل نہیں ہے۔ بے پردگی کے بارے میں احکامات واضح ہیں، تاریخی حقیقت ہے کہ ایک جنگ میں طے قبیلے کی ایک لڑکی اسیر ہو کر آئی تھی، وہ بے پردہ تھی، اس غیر مسلم بیٹی کو بے پردہ دیکھ کر حضور ﷺ نے اپنی وہ مبارک ردا جس کا ایک ایک تار ہزاروں رحمتوں اور برکتوں کا خزینہ تھا اس بے پردہ بیٹی کے چہرے پر تان دی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد یہ خوب صورت شعر لکھا تھا:

ما ازاں خاتون طے عریاں تریم
پیش اقوام جہاں بے چادر یم

غور فرمائیے کہ ''نعت کے اس دور میں'' نعت نمبر کیا سے کیا رخ اختیار کر رہے ہیں؟ واضح رہے کہ جسے حضور ﷺ کے حسین چہرے سے محبت ہوگی وہ اپنے چہرے کو بھی اسی انذز سے آراستہ کرنے کی سعی کرے گا۔ سنت رسول ﷺ کو آئینہ سامنے رکھ کر، ہر صبح ذبح کرنا اور خود کو خوب صورت سمجھنا، کسی نوع کی توصیف رسول ﷺ ہے۔ اس ضمن میں نہ کوئی عذر ہے نہ کوئی دلیل، سوائے احساس ندامت اور اعتراف محرومی کے، اسلامی صورت بنا لینے سے عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ دل کی دنیا بھی اجال دیں۔ کہتے ہیں کہ چہرہ، دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ''حضور ﷺ ہم سے محض خراج عقیدت نہیں، بلکہ خراج اطاعت لینے کے لیے تشریف لائے تھے'' اطاعت ہی عقیدت ہے۔ ان جملہ ہائے معترضہ کے لیے معذرت خواہ ہوں مگر کیا کیا جائے کہ ''عصری حقایق کی چھوٹ تو افکار و تحریر پر پڑا ہی کرتی ہے۔''

جناب کشفی کے نزدیک مقام عبدیت اور مقام رسالت مآب ﷺ سے عدم آگہی کا نتیجہ ہے کہ اکثر نعتوں میں مجازی محبوب کے کوچے کی طرح مدینہ منورہ کے پرنور گلی کوچوں کا ذکر کیا جاتا ہے لازم ہے کہ مدینہ منورہ کے وہ فضائل پیش نظر رہیں جنھیں خود حضور ﷺ نے بیان فرمایا ہے۔ نعت گو حضرات مدینہ اور جنت کا تقابل بھی اس انداز سے کرتے ہیں جس سے جنت کی تحقیر کا پہلو نکلتا ہے اور ''جنت کا یہ استخفاف قرآن ناشناسی کا نتیجہ اور سستی جذباتیت ہے''

چوں کہ جناب کشفی حسن اتفاق سے خود نعت گو بھی ہیں اس لیے مبصر اور تذکرہ نگار کو ایک نظر یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ وہ خود اپنی نعتوں میں، مدینہ طیبہ کا ذکر کس پیرائے میں کرتے ہیں، آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

درکار نہیں مجھ کو کوئی سایۂ دیوار
طیبہ کی ہوا غم کے ازالے کے لیے ہے

☆

طیبہ کا سفر مرحلۂ خوف و رجا ہے
ہونٹوں پہ تبسم ہے مگر آنکھ تو نم ہے

☆

ہے کشاد در دل سیّد والا ﷺ کی عطا
درد و احساس مدینے کی ہوا میں شامل
ماہ دو ہفتہ کئی رنگ لیے آیا ہے
رنگ فردوس مدینے کی ضیا میں شامل

☆

جادۂ عشقِ محمد ﷺ کا تسلسل دیکھو

نہیں اس راہ میں یارو کوئی منزل، کوئی سنگ
آسماں گنبدِ خضریٰ سے فرو تر نکلا
یہ حقیقت ہے نہیں کوئی نظر کا نیرنگ

☆

ہم مدینے کی زمیں میں اس طرح مدفون ہوں
خاک پائے مصطفیٰ ﷺ، بس یہ صلہ ہم کو ملے

☆

وجود حضرت انساں کے ارتقا کے لیے
ہُوا مدینے میں اک تازہ آسماں پیدا

☆

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے
تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہ شاہ ﷺ مدینہ مرے آگے

☆

ہے ماہ دو ہفتہ ترے کاشانے کی قندیل
ہے خاک بسر اوجِ ثریا ترے آگے
تھا درد کے دریا میں تلاطم ترے پیچھے
سمٹا ہے مرے درد کا دریا ترے آگے

☆

مدینہ شہر نہیں ہے، مری تمنا ہے
مدینہ ایک اشارہ ہے روشنی کی طرف
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لیے
مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسن کلام
مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے

نہیں اس راہ میں یارو کوئی منزل، کوئی سنگ
آسماں گنبدِ خضریٰ سے فرو تر نکلا
یہ حقیقت ہے نہیں کوئی نظر کا نیرنگ

☆

ہم مدینے کی زمیں میں اس طرح مدفون ہوں
خاک پائے مصطفیٰ ﷺ، بس یہ صلہ ہم کو ملے

☆

وجود حضرت انساں کے ارتقا کے لیے
ہُوا مدینے میں اک تازہ آسماں پیدا

☆

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے
تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہ شاہ ﷺ مدینہ مرے آگے

☆

ہے ماہ دو ہفتہ ترے کاشانے کی قندیل
ہے خاک بسر اوجِ ثریا ترے آگے
تھا درد کے دریا میں تلاطم ترے پیچھے
سمٹا ہے مرے درد کا دریا ترے آگے

☆

مدینہ شہر نہیں ہے، مری تمنا ہے
مدینہ ایک اشارہ ہے روشنی کی طرف
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لیے
مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسن کلام
مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے
مدینہ دولت بیدار آدمی کے لیے
مدینہ تابش و انوار، زندگی کے لیے
مدینہ ہوش کا پیغام بے خودی کے لیے
مدینہ راہ تمنا پہ نقش آخر ہے
مدینہ فرش کی عظمت کا استعارہ ہے
مدینہ صاحب کوثر کا مستقر ٹھہرا
مدینہ مطلعٔ امکان آدمی ٹھہرا

☆

آسماں خاک مدینہ کی سلامی کے لیے
مہ و خورشید کی کرنوں کو لیے آتا ہے
آسماں حد نظر، حد نظر

☆

میں ریاض نبی ﷺ میں بیٹھا ہوں
نقش جنت نما ہے آنکھوں میں
میرے چہرے پہ عکس ہے ان ﷺ کا
انؐ کا چہرہ چھپا ہے آنکھوں میں
یہ میں عثمانؓ دیکھ لو ان کو
کیسا رنگ حیا ہے آنکھوں میں
چشم کیفی میں گنبد خضریٰ
''دولت بے بہا ہے آنکھوں میں''
ان کے روضے کی جالیاں دل میں
ایسا نقشہ کھنچا ہے آنکھوں میں
ان کی امت کا فرد ہے کشفی
ایک اذن عطا ہے آنکھوں میں

☆

علمی آگہی کے فقدان کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ نعتوں میں نبیؐ کریم ﷺ کے معنی آفرین اسمائے مبارک کا ذکر بھی محض لفظی اور سطحی انداز سے کیا جا رہا ہے اور بعض اوقات شعری اوزان کی مجبوریوں کے تحت، یہ بھی یاد رہے کہ آخری اور کامل ترین پیغمبر ﷺ کا گزشتہ انبیا سے صفاتی تقابل، خود نبیؐ کریم ﷺ کا استخفاف ہے اللہ تعالیٰ کی حقیقی رفعتوں اور حضور ﷺ کی حقیقی عظمتوں سے شناسا نہ ہونے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بجائے حضور ﷺ ہی کو روزِ جزا کا مالک و آقا قرار دیا جا رہا ہے اور دلیل یہ ہے کہ مالک کا حبیب، مالک ہی ہوا کرتا ہے حضرت جبریل علیہ السلام کی تحقیر بھی اکثر نعتوں میں نظر آتی ہے...ان امور سے بچنا ہی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ حد سے تجاوز ہی عقیدت کو بدعت اور توصیف کو تنقیص بنا دیتا ہے۔ اگر ایک نعت گو، واقعیت کی انگلی تھام کر نہیں چلے گا، اور شاعری کی رو میں بہہ کر مبالغے کو عقیدت سمجھتا رہے گا تو اس کی حیثیت قرآن پاک میں مذکورہ شعراء کی سی ہوگی جو خود بھی گمراہ ہیں اور جن کے متبعین بھی گم کردہ منزل، آج کے نعت گو حضرات کو ان شاعروں کے طرز فکر کو سامنے رکھنا چاہیے، جن کو قرآن پاک نے بنظر تحسین دیکھا ہے۔

نشتریت اور ایمائیت شعر کی خصوصیات ہیں۔ لہجے کی کاٹ اور انداز کی شگفتگی کے دل میں ترازو ہونے کا دوسرا نام ''تغزل'' ہے۔ جو نثر میں بھی ہوسکتا ہے۔فنی اعتبار سے نعت میں ''تغزل'' لازم ہے۔ جبکہ معنوی لحاظ سے سوز دروں کی آنچ ضروری ہے۔ یہ سوزِ دروں سنت رسول ﷺ کی پیروی اور مقام رسالت مآب ﷺ کی علمی آگہی سے عبارت ہے اسی اطاعت اور اسی آگہی سے علم و نظر کی دنیا جگمگا سکتی ہے اور یہی اُجالا جب قلم کی نوک پر لو دیتا ہے تو حرف حرف روشنی برساتا نظر آتا ہے...آپ ﷺ کے مقام کو قرآن عظیم اور احادیث نبوی ﷺ کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے اس کے بغیر افراط و تفریط کا وہی عالم رہے گا جو آج ہے۔☆[۲۵] جناب کشفی لکھتے لکھتے نعت کے بارے میں بعض ایسے خوب صورت جملے اور بلیغ تراکیب لکھ گئے ہیں جو بظاہر بے ساختہ ہیں مگر اپنے اندر مفہوم و مطالب کی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں، ایک نظر دیکھنے سے قبل اقبال ساجد کا یہ شعر بھی گنگنا لیجیے کہ :

ترے عکسوں پہ گویا آج بھی ہے دسترس میری
یہ جب شیشے میں آتے ہیں مری تحریر بنتے ہیں

☆۔ نعت، نغمۂ نور ہے۔
☆۔ نعت، روح کا ترانہ ہے۔
☆۔ یہ روحانی تغزل ہے۔
☆۔ ایک ایسی جنبش لب ہے جس میں روح لفظوں میں ڈھل جاتی ہے اسی نسبت سے لفظ معتبر

☆

علمی آگہی کے فقدان کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ نعتوں میں نبیٔ کریم ﷺ کے معنی آفرین اسمائے مبارک کا ذکر بھی محض لفظی اور سطحی انداز سے کیا جا رہا ہے اور بعض اوقات شعری اوزان کی مجبوریوں کے تحت، یہ بھی یاد رہے کہ آخری اور کامل ترین پیغمبر ﷺ کا گزشتہ انبیا سے صفاتی تقابل، خود نبیٔ کریم ﷺ کا استخفاف ہے اللہ تعالیٰ کی حقیقی رفعتوں اور حضور ﷺ کی حقیقی عظمتوں سے شناسا نہ ہونے کا نتیجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بجائے حضور ﷺ ہی کو روزِ جزا کا مالک و آقا قرار دیا جا رہا ہے اور دلیل یہ ہے کہ مالک کا حبیب، مالک ہی ہوا کرتا ہے حضرت جبریل علیہ السلام کی تحقیر بھی اکثر نعتوں میں نظر آتی ہے... ان امور سے بچنا ہی تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ حد سے تجاوز ہی عقیدت کو بدعت اور توصیف کو تنقیص بنا دیتا ہے۔ اگر ایک نعت گو، واقعیت کی انگلی تھام کر نہیں چلے گا، اور شاعری کی رو میں بہہ کر مبالغے کو عقیدت سمجھتا رہے گا تو اس کی حیثیت قرآن پاک میں مذکورہ شعراء کی سی ہوگی جو خود بھی گمراہ ہیں اور جن کے متبعین بھی گم کردہ منزل، آج کے نعت گو حضرات کو ان شاعروں کے طرز فکر کو سامنے رکھنا چاہیے، جن کو قرآن پاک نے بنظر تحسین دیکھا ہے۔

نشتریت اور ایمائیت شعر کی خصوصیات ہیں۔ لہجے کی کاٹ اور انداز کی شگفتگی کے دل میں ترازو ہونے کا دوسرا نام ''تغزل'' ہے۔ جو نثر میں بھی ہوسکتا ہے۔ فنی اعتبار سے نعت میں ''تغزل'' لازم ہے۔ جبکہ معنوی لحاظ سے سوز دروں کی آنچ ضروری ہے۔ یہ سوزِ دروں سنت رسول ﷺ کی پیروی اور مقام رسالت مآب ﷺ کی علمی آگہی سے عبارت ہے اسی اطاعت اور اسی آگہی سے علم و نظر کی دنیا جگمگا سکتی ہے اور یہی اُجالا جب قلم کی نوک پر لو دیتا ہے تو حرف حرف روشنی برساتا نظر آتا ہے... آپ ﷺ کے مقام کو قرآن عظیم اور احادیث نبوی ﷺ کے مطالعے سے سمجھا جاسکتا ہے اس کے بغیر افراط و تفریط کا وہی عالم رہے گا جو آج ہے۔☆[۲۵] جناب کشفی لکھتے لکھتے نعت کے بارے میں بعض ایسے خوب صورت جملے اور بلیغ تراکیب لکھ گئے ہیں جو بظاہر بے ساختہ ہیں مگر اپنے اندر مفہوم و مطالب کی ایک دنیا لیے ہوئے ہیں، ایک نظر دیکھنے سے قبل اقبال ساجد کا یہ شعر بھی گنگنا لیجیے کہ:

ترے عکسوں پہ گویا آج بھی ہے دسترس میری
یہ جب شیشے میں آتے ہیں مری تحریر بنتے ہیں

☆۔ نعت، نغمۂ نور ہے۔
☆۔ نعت، روح کا ترانہ ہے۔
☆۔ یہ روحانی تغزل ہے۔
☆۔ ایک ایسی جنبش لب ہے جس میں روح لفظوں میں ڈھل جاتی ہے اسی نسبت سے لفظ معتبر ہوجاتے ہیں۔
☆۔ شعر میں جذبے کی بیکرانی اور اس مرکز صدق و صفا سے شاعر کا تعلق ہی اس کی جہت متعین کرتا ہے۔
☆۔ نعت میں الفاظ ''خود بخود'' خوشبو اور روشنی کے قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔
☆۔ نعت، شعر عقیدت ہے کہ عقیدت کا ہر موضوع اور کردار مرکز احدیت اور ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے ہم رشتہ ہے۔ یہ ذکر زبان و اسلوب کے اُن سارے قرینوں اور سلیقوں کا تقاضا کرتا ہے، جو ذہن، فن اور زبان پر انسانی دسترس کی آخری حدوں پر نظر آتے ہیں۔
☆۔ نعت ایک سیارہ اور شرار معنوی ہے
☆۔ ضروری ہے کہ غزل کی شوریدہ بیانی، نعت میں آداب عبادت کے قالب میں ڈھل جائے۔
☆۔ نعت ایک مستقل صنف سخن ہے، ہیئت کی بنیاد پر نہیں، موضوع کی بنیاد پر
☆۔ لفظ جذبے کے بغیر شعر نہیں بنتا، ہم وزن ہم جنس اور ہم قافیہ لفظوں کے جوڑنے کو شاعری نہیں کہتے...

اب نعتوں میں یہ طرز عام نظر آتی ہے مگر ایسی نعتوں میں اس جذبہ کی جھلک نہیں ملتی جو حضوری اور محبت کی نشان دہی کرے۔

☆۔ نعت ایک تجلیٔ مسلسل ہے۔
☆۔ لفظ، حضور ﷺ کی خاک پا سے مس ہوکر آئینہ صفت اور قیمت میں روکش لعل و جواہر ہوجاتے ہیں۔
☆۔ نعت کو تو سرورِ کائنات ﷺ اور شاعر کے رشتہ کی دستاویز ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی اپنے ایک مضمون ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' (نعت رنگ ۹) میں لکھتے ہیں ''نعت پر اپنے مضامین میں میں نے اکثر یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد و نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اکثر تو شاعر کو خود بھی اس سفر کی خبر نہیں ہوتی، ایک بار حضرت احسان دانش نے اپنا یہ شعر سنایا:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقش کف پا ڈھونڈنے کو

شعر سن کر میں نے بے ساختہ کہا کہ ''نعت کا کیسا اچھا شعر ہے'' مرحوم نے فرمایا ''میں نے تو یہ شعر نعت میں نہیں کہا ہے'' میں نے عرض کیا کہ ''تخلیق ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے ضروری نہیں کہ فنکار کو تخلیق کے ہنگام اپنے عمل کے تمام محرکات و عوامل کا علم اور شعور ہو۔ تخلیق میں تو ہمارا پورا وجود شامل ہوتا ہے۔ شعور بھی، لاشعور بھی، یہی نہیں بلکہ ہمارا معاشرتی اور اجتماعی شعور بھی اس عمل میں شامل ہوتا ہے۔

پھر بات کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ خاصی دیر کے بعد احسان دانش مرحوم چونکے میری طرف مڑے اور کہنے لگے ''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

☆☆

''اچھی غزل ایک اکائی اور وحدت ہوتی ہے آپ غالب کی کسی غزل کو لے لیجیے اور بات صرف غالب تک محدود نہیں ہے کسی بھی بڑے یا اچھے شاعر کی غزل کو لے لیجیے اور اس کے اشعار کی ترتیب بدل دیجیے یقیناً غزل کی وحدت متاثر ہوگی اور یہ اکائی ٹوٹ جائے گی یا مجروح ہوگی۔ پھر غزل کی اس گہرائی اور گرفت کو کیا نام دیا جائے کہ اس کا ہر شعر ایک اکائی اور وحدت ہے۔ غزل کے ایک شعر میں بڑے تجربے یوں سمٹ جاتے ہیں جس طرح آسمان، آنکھ کی پتلی میں سما جاتا ہے۔''

☆☆

''ہم غزل کے ان اشعار کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جن کا موضوع ہمارے خیال میں حضرت رسالت مآب ﷺ کی مدح و ثنا ہے۔ خواہ شاعر کو شعر کہتے وقت یہ خیال بھی نہ آیا ہو ہم عرض کر چکے ہیں کہ تخلیق شعر ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے۔''

''فیض صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ لغت میں مذہب کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے جیل کے ساتھیوں کی شہادت موجود ہے کہ وہ ایام اسیری میں درس قرآن حکیم دیتے تھے پھر یہ روایت کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اپنے آبائی وطن گئے اور وہاں نماز کی امامت کی۔ ان کی شاعرانہ لغت اور امیجری میں بھی مذہب اور اس کی روایات بہت نمایاں ہیں۔ ''شورش زنجیر بسم اللہ'' ''آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی'' ترا حسن دست عیسیٰ، تری یاد روئے مریم'' ایسے شاعر کے کلام میں مجھے کوئی نعت نظر نہ آئی اور پھر ہوا یوں کہ

ٹیلی وژن کے ایک مذاکرے میں میں نے کہا کہ اردو کے ہر بڑے شاعر کے کلام میں ہمیں نعت نظر آتی ہے۔ شعرا اپنے دیوان یا کلیات کا آغاز حمد و نعت کے اشعار سے کرتے تھے۔ آج بھی یہ دستور قائم ہے لیکن عہد حاضر کے ایک بڑے اور اہم شاعر کے کلام میں ہمیں نعت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ شاید یہ بات اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہی گئی تھی کہ سننے والوں کا ذہن فیض صاحب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد بہن ہاجرہ مسرور نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں وقت پر پہنچ گیا فیض صاحب پہلے سے موجود تھے۔ دوسرے مہمان ابھی نہیں آئے تھے۔ میں نے فیض صاحب کو سلام کیا۔ انھوں نے بے دلی سے جواب دیا یہ وہ فیض صاحب نہیں تھے جن سے میں واقف تھا کمرے میں ایک خاموشی طاری تھی۔ ذہن میں آیا کہ فیض صاحب ناراض ہیں دل کا چور زبان پر آگیا۔ میں نے کہا ''فیض صاحب کیا بات ہے آپ کچھ ناراض سے معلوم ہوتے ہیں'' فیض صاحب نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ جس ذاتِ گرامی ﷺ کے حوالے سے آپ نے ٹیلی ویژن پر

پھر بات کا رخ کسی اور طرف مڑ گیا۔ خاصی دیر کے بعد احسان دانش مرحوم چونکے میری طرف مڑے اور کہنے لگے ''تم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

☆☆

''اچھی غزل ایک اکائی اور وحدت ہوتی ہے آپ غالب کی کسی غزل کو لے لیجیے اور بات صرف غالب تک محدود نہیں ہے کسی بھی بڑے یا اچھے شاعر کی غزل کو لے لیجیے اور اس کے اشعار کی ترتیب بدل دیجیے یقیناً غزل کی وحدت متاثر ہوگی اور یہ اکائی ٹوٹ جائے گی یا مجروح ہوگی۔ پھر غزل کی اس گہرائی اور گرفت کو کیا نام دیا جائے کہ اس کا ہر شعر ایک اکائی اور وحدت ہے۔ غزل کے ایک شعر میں بڑے تجربے یوں سمٹ جاتے ہیں جس طرح آسمان، آنکھ کی پتلی میں سما جاتا ہے۔''

☆☆

''ہم غزل کے ان اشعار کو بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے جن کا موضوع ہمارے خیال میں حضرت رسالت مآب ﷺ کی مدح و ثنا ہے۔ خواہ شاعر کو شعر کہتے وقت یہ خیال بھی نہ آیا ہو ہم عرض کر چکے ہیں کہ تخلیق شعر ایک بے حد پیچیدہ اور طلسماتی عمل ہے۔''

''فیض صاحب کی زندگی اور ان کی شاعرانہ لغت میں مذہب کے گہرے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان کے جیل کے ساتھیوں کی شہادت موجود ہے کہ وہ ایام اسیری میں درس قرآن حکیم دیتے تھے پھر یہ روایت کہ وہ اپنی وفات سے پہلے اپنے آبائی وطن گئے اور وہاں نماز کی امامت کی۔ ان کی شاعرانہ لغت اور امیجری میں بھی مذہب اور اس کی روایات بہت نمایاں ہیں۔ ''شورش زنجیر بسم اللہ'' ''آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی'' ترا حسن دست عیسیٰ، تری یاد روئے مریم'' ایسے شاعر کے کلام میں مجھے کوئی نعت نظر نہ آئی اور پھر ہوا یوں کہ

ٹیلی وژن کے ایک مذاکرے میں میں نے کہا کہ اردو کے ہر بڑے شاعر کے کلام میں ہمیں نعت نظر آتی ہے۔ شعرا اپنے دیوان یا کلیات کا آغاز حمد و نعت کے اشعار سے کرتے تھے۔ آج بھی یہ دستور قائم ہے لیکن عہد حاضر کے ایک بڑے اور اہم شاعر کے کلام میں ہمیں نعت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ شاید یہ بات اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اس طرح کہی گئی تھی کہ سننے والوں کا ذہن فیض صاحب کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد بہن ہاجرہ مسرور نے اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ میں وقت پر پہنچ گیا فیض صاحب پہلے سے موجود تھے۔ دوسرے مہمان ابھی نہیں آئے تھے۔ میں نے فیض صاحب کو سلام کیا۔ انھوں نے بے دلی سے جواب دیا یہ وہ فیض صاحب نہیں تھے جن سے میں واقف تھا کمرے میں ایک خاموشی طاری تھی۔ ذہن میں آیا کہ فیض صاحب ناراض ہیں دل کا چور زبان پر آگیا۔ میں نے کہا ''فیض صاحب کیا بات ہے آپ کچھ ناراض سے معلوم ہوتے ہیں'' فیض صاحب نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور پھر اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں کہنے لگے کہ جس ذات گرامی ﷺ کے حوالے سے آپ نے ٹیلی ویژن پر اپنے غصے یا دوسروں کی کوتاہی کا جس طرح اظہار کیا تھا، اس انداز کا اس ذات سے کوئی علاقہ نہ تھا۔ کسی گنہ گار یا خطا کار کے کانوں میں جو بات کہنی چاہیے اس کو دُنیا میں یوں پھیلانے کا خلق عظیم محمدی ﷺ سے کیا تعلق ہے اور آپ تو ادب کے استاد ہیں کیا آپ اپنے طالب علموں کو اس بت ہزار شیوہ سے متعارف نہیں کراتے جسے غزل کہتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمدردی اور دل بیدار کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے بعد فیض صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا:

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اور شاید یہ فیض صاحب ہی کا فیضان نظر ہے کہ غزل کی ماہیت کا یہ پہلو مجھ پر روشن تر ہوگیا۔''

☆☆

''فیض صاحب کے نعتیہ شعر ''ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک'' کے سلسلے میں ہم نے عرض کیا تھا کہ ''لفظوں کو ایسی لسانی فضا عطا کی گئی ہے کہ وہ حدود اور تنگیوں کو توڑ کر وسعتوں کی طرف پرواز کرتے نظر آتے ہیں۔''

☆☆

فیض صاحب کے دو شعروں پر تو گفتگو آپ کے سامنے آچکی ہے اب چند اور شعر ملاحظہ کیجیے:

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

☆

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجات دل کا عالم
ترا حسن دست عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

☆

سکھی یہیں مرے دل کافر نے بندگی
رب کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے

ارمان اکبر آبادی کے مجموعۂ نعت ''سروش سدرہ'' کا پیش لفظ کشفی صاحب نے ''نسبت ارمان'' کے عنوان سے تحریر فرمایا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

''غزل کی اشاریت اور ایمائیت تو ہر اس شعر کو نعت کے حدود میں شامل کر دیتی ہے جو محدود سے سفر کرتے ہوئے لامحدود کو چھو لیتا ہے خواہ اس کا موضوع کچھ بھی ہو۔ میں یہ نکتہ اس سے پہلے بھی دوسری

تحریروں میں بیان کر چکا ہوں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجیے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے

آج اس شعر کو سن کر ہمارا ذہن صرف نبی ﷺ کی طرف منتقل ہوتا ہے تجمل حسین خاں کی طرف نہیں کیوں کہ یہ لباس شعر ان کی قامت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا"

☆☆

جناب کشفی غزل کے تیور شناس ہیں اور جسے اس ہزار شیوہ نازنین کی نگاہ نے اپنا آشنائے راز بنا لیا ہو وہ اپنی "خوبیٔ قسمت" پر بجا طور پر ناز کرسکتا ہے۔ حضرت ثاقب کان پوریؒ بروقت یاد آگئے۔ وہ غزل ہی سے یوں مخاطب ہیں:

تیری ان رعنائیوں کا اے جمال پردہ دار
ایک ثاقب ہے جو کچھ کچھ محرم اسرار ہے

اس سلسلے میں احقر کو اپنی علمی لاعلمی اور ادبی بے مائیگی کا کماحقہ اعتراف ہے، مگر میں جناب کشفی کے درج بالا اقتباسات کو پڑھتا بھی رہا اور سوچتا بھی۔ اس دوران میں غزل کے کئی شعر حاشیہ خیال پر ستاروں کی طرح ابھرتے رہے اور مطالبہ کرتے رہے کہ ہمارا کیا قصور ہے، ہمیں بھی نعت میں شامل کر لیجیے گا کہ ہم بھی لامحدود کو چھو رہے ہیں، غزلیات، قصائد اور مناقب میں بے شمار ایسے اشعار مل سکتے ہیں جو موضوع اور ممدوح دونوں سے کہیں رفیع و عظیم ہیں۔ بلکہ بعض تو لامحدود سے آگے جا کر، حمد بھی قرار دیے جاسکتے ہیں یوں عام تعریف و توصیف کا ہر مبالغہ آمیز شعر، نعت بن سکتا ہے، میرے ذہن میں یہ بات بھی آتی رہی کہ نعت وہی ہے جسے تصور کی وحدت، خیال کے تقدس اور قلم کی پاکیزگی کے ساتھ کہا یا لکھا گیا ہو، جسے خود شاعر نے نعت کا نام دیا ہو (یہ الگ بات کہ نعتوں میں بہت سے شعر ایسے ہیں جو فکر و خیال اور اسلوب و ادا کی رفعتوں سے یکسر محروم ہیں اور اگر ان اشعار کو نعت کے عنوان سے الگ کر دیا جائے تو وہ محض غزل کے چند شعر دکھائی دیتے ہیں)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غزل ایک ہمہ جہت اور جاندار صنف سخن ہے۔ اس کی خوبی ہے کہ "وہ جذبات کی سہیلی اور واردات کی ہمجولی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو حسن میں بستی ہے وہ انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے۔ یہ کہنا بھی سچ ہے کہ غزل تخیل کی وہ معراج ہے جو دیوانگی میں قیس و فرہاد اور فرزانگی میں میر و غالب کو عطا ہوتی ہے۔" یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کے اشعار، ذوق اور ظرف کے مطابق ہر قلم کار کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک ناقد یا مضمون نگار نعت کے موضوع پر لکھتے لکھتے غزل کے کسی شعر کو محض تفہیم مطالب کے لیے سپرد قلم کر دے تو موضوع کی چاندنی میں وہ شعر جگمگا تو جائے گا مگر اُسے نعت کا شعر قرار نہیں دیا جائے گا۔ کتنے ہی غزل کے شعر ہیں جو ہم

تحریروں میں بیان کر چکا ہوں۔ مثال کے طور پر غالب کا یہ شعر لیجیے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بو سے مری زباں کے لیے

آج اس شعر کو سن کر ہمارا ذہن صرف نبی ﷺ کی طرف منتقل ہوتا ہے تجمل حسین خاں کی طرف نہیں کیوں کہ یہ لباس شعران کی قامت سے کوئی نسبت نہیں رکھتا''

☆☆

جناب کشفی غزل کے تیور شناس ہیں اور جسے اس ہزار شیوہ نازنین کی نگاہ نے اپنا آشنائے راز بنا لیا ہو وہ اپنی ''خوبیٔ قسمت'' پر بجا طور پر ناز کرسکتا ہے۔ حضرت ثاقب کان پوریؒ بروقت یاد آگئے۔ وہ غزل ہی سے یوں مخاطب ہیں:

تیری ان رعنائیوں کا اے جمال پردہ دار
ایک ثاقب ہے جو کچھ کچھ محرم اسرار ہے

اس سلسلے میں احقر کو اپنی علمی لاعلمی اور ادبی بے مائیگی کا کماحقہ اعتراف ہے، مگر میں جناب کشفی کے درج بالا اقتباسات کو پڑھتا بھی رہا اور سوچتا بھی۔ اس دوران میں غزل کے کئی شعر حاشیہ خیال پر ستاروں کی طرح ابھرتے رہے اور مطالبہ کرتے رہے کہ ہمارا کیا قصور ہے، ہمیں بھی نعت میں شامل کر لیجیے گا کہ ہم بھی لامحدود کو چھو رہے ہیں، غزلیات، قصائد اور مناقب میں بے شمار ایسے اشعار مل سکتے ہیں جو موضوع اور ممدوح دونوں سے کہیں رفیع و عظیم ہیں۔ بلکہ بعض تو لامحدود سے آگے جا کر، حمد بھی قرار دیے جاسکتے ہیں یوں عام تعریف و توصیف کا ہر مبالغہ آمیز شعر، نعت بن سکتا ہے، میرے ذہن میں یہ بات بھی آتی رہی کہ نعت وہی ہے جسے تصور کی وحدت، خیال کے تقدس اور قلم کی پاکیزگی کے ساتھ کہا یا لکھا گیا ہو، جسے خود شاعر نے نعت کا نام دیا ہو (یہ الگ بات کہ نعتوں میں بہت سے شعر ایسے ہیں جو فکر و خیال اور اسلوب و ادا کی رفعتوں سے یکسر محروم ہیں اور اگر ان اشعار کو نعت کے عنوان سے الگ کر دیا جائے تو وہ محض غزل کے چند شعر دکھائی دیتے ہیں)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غزل ایک ہمہ جہت اور جاندار صنف سخن ہے۔ اس کی خوبی ہے کہ ''وہ جذبات کی سہیلی اور واردات کی ہمجولی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت ہے جو حسن میں بستی ہے وہ انسانی فطرت کی خلقی افتاد کا ابدی اظہار ہے۔ یہ کہنا بھی سچ ہے کہ غزل تخیل کی وہ معراج ہے جو دیوانگی میں قیس و فرہاد اور فرزانگی میں میر و غالب کو عطا ہوتی ہے۔'' یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کے اشعار، ذوق اور ظرف کے مطابق ہر قلم کار کا ساتھ دیتے ہیں۔ ایک ناقد یا مضمون نگار نعت کے موضوع پر لکھتے لکھتے غزل کے کسی شعر کو محض تفہیم مطالب کے لیے سپرد قلم کر دے تو موضوع کی چاندنی میں وہ شعر جگمگا تو جائے گا مگر اُسے نعت کا شعر قرار نہیں دیا جائے گا۔ کتنے ہی غزل کے شعر ہیں جو ہم نعتیہ موضوعات پر لکھتے ہوئے استعمال کر جاتے ہیں اور لامحدود فضا میں پہنچے ہوئے کتنے ہی شعر ہیں جو دیار خدا و رسول ﷺ میں دل کو کیف اور روح کو سرخوشی کی ایک دنیا عطا کرتے ہیں۔ وہ ترجمان دل بے قرار تو یقیناً ہیں۔ مگر انھیں نعت کا شعر نہیں کہا جاسکتا۔ ایک طرف تو ہماری یہ آرزو ہے کہ نعت کو غزل کے مجازی رنگ ڈھنگ سے ہر قیمت پر بچایا جائے اور دوسری جانب یہ اصرار کہ ''تجمل حسین خاں'' نامی کسی دنیاوی شخصیت کی شان میں لکھے گئے ایک توصیفی شعر کو محض اس لیے نعت کا شعر سمجھ لیا جائے کہ دوسرے مصرعے میں نطق، زبان کے بوسے لے رہا ہے اگر یہی خیال دامن دل کھینچ رہا ہے تو کیوں نہ اسی خیال کے حامل، غالب ہی کے درج ذیل شعر کو اپنا لیا جائے کہ وہ کلیتاً نعت کا ہے:

تا نام مے و ساقیٔ کوثر ﷺ بہ زباں رفت
صدرہ لبم از مہر ببو سید زباں را

گو یہ خیال خاقانی سے مستعار ہے اور خاقانی کا متعلق شعر، آسی کی شرح کلامِ غالب میں، غالباً موجود ہے اور ''نطق'' کے مقابلے میں ''لب'' کا لفظ کہیں واضح اور معنی آفرین ہے جبکہ لفظ ''مے'' بھی قابل غور ہے... کہاں ''الفقر فخری'' کی عظمت و صولت اور کہاں فرخ آباد کا نواب کہ... بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے:

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعت شہ کونینؐ و مدیح کے وجم را

اگر محدود سے لامحدود فضا میں داخل ہونے والے مبالغہ آمیز اشعار کو ہمارا ذوق، نعتیہ قرار دینا شروع کر دے گا تو بہت سے شاعروں کو اپنی عاقبت کی خاطر کہنا پڑے گا کہ ''ہم نے اسے نعت کے لیے نہیں کہا، یہ محض آپ کے تصور کی رعنائی اور یکتائی ہے کہ خاک سے افلاک کی طرف پرواز کرنے والا ہر شعر، آپ کو گنبد خضریٰ کا طواف کرتا دکھائی دیتا ہے۔'' احقر کے خیال میں نعت کا وہ شعر جو محدود سے لامحدود کی جانب مصروف سفر نہیں، وہ نعت سے منسوب ہوتے ہوئے بھی نعت کا شعر نہیں ہے جبکہ غزل اور قصیدے کا وہ شعر جو عام نوعیت کی بشری خصوصیات سے بالاتر اور پاکیزہ تر ہے، جو عقیدت آمیز مبالغے کی بنا پر لامحدود کی جانب مائل پرواز ہے۔ وہ بالیقین نعت کا شعر نہیں ہے، مگر اس پر نعت کا گماں سا گزرتا ہے اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش شاعر اسے نعت کا بنا جاتا تو یہ شعر اس کے لیے توشۂ آخرت بن جاتا۔ دیکھنا پڑے گا کہ لکھنے والے نے کس ماحول میں، کس قلم سے، کس زبان سے اور کس کے لیے اپنے خیال کو مبالغہ آفرینی سے حسن و تاثر دینے کی سعی کی ہے۔ اس مبالغہ آفرینی کو حضور ﷺ پر کیسے منطبق کریں گے جن کی توصیف کے لیے شرائط و حدود ہیں، زبان و قلم کو سو بار عطر و گلاب سے وضو کرانا پڑتا ہے۔ نگاہوں کو حیا اور دل کو ضیا عطا کرنے کی سچی سعی کرنا پڑتی ہے۔ پلکوں پر ستاروں کو سجانا اور آنکھ کی پتلیوں

میں گنبد خضریٰ کا عکس ابھارنا پڑتا ہے۔ تب نعت ہوتی ہے ورنہ تو شخصی قصائد کے دفتر موجود ہیں اور ان کا ہر مبالغہ آفرین شعر، نعت ہو سکتا ہے، محدود سے لامحدود میں داخل ہونے والے اشعار میرے خیال میں آفاقی تو قرار دیے جا سکتے ہیں نعت کے نہیں۔ نعت گوئی کے ضمن میں خود جناب کشفی اپنی ایک نعت میں کچھ شرائط یوں عائد کر رہے ہیں:

ذہن کو اپنے سجالوں تو ترا نام لکھوں
اپنے لمحوں کو اجالوں تو ترا نام لکھوں
شہر طیبہ میں گزاری ہوئی ہر ساعت کی
یاد کو دل میں بسالوں تو ترا نام لکھوں
گنبد سبز کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام
اس کی تصویر بنالوں تو ترا نام لکھوں
روضۂ پاک کے نظارے کو نغمے کی طرح
روح کے ساز پہ گا لوں تو ترا نام لکھوں
میرے مولاً، تری کملی سے ابھرتا سورج
اس کو آئینہ بنا لوں تو ترا نام لکھوں
تیری برکت سے منور ہوئیں، جن کی آنکھیں
ان کے لہجے کو نبھالوں تو ترا نام لکھوں
خواجۂ وسعت افلاک و زمیں تجھ پہ سلام
تیری لو دل میں بڑھا لوں تو ترا نام لکھوں

احقر نے اس ضمن میں اپنے ایک فاضل دوست (پروفیسر میاں محمد یعقوب) سے استفسار کیا، ان کا جواب درج ذیل ہے:

جناب ابوالخیر کشفی کی علمیت اور نبیٔ رحمت ﷺ سے ان کی محبت اور عقیدت ہر شک و ریب سے بالا ہے لیکن جب وہ فرماتے ہیں کہ ''شعر جب محدود سے لامحدود میں داخل ہوتا ہے تو نعت کا شعر ہو جاتا ہے'' تو تمام تر ادب و احترام اور تمام ممکنہ پہلوؤں پر غور کرنے کے باوجود اختلاف کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔

ہر وہ شعر جو محدود سے لامحدود میں داخل ہوتا ہے ''سحر'' تو ہوتا ہے نعت نہیں یا ہم اسے زماں و مکاں سے ماورئ آفاقی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اردو، فارسی، عربی، ہندی اور دُنیا کی ہر زبان میں ایسے اشعار موجود ہوتے ہیں (اگرچہ کم کم) جو رنگ و نسل، حدود و ثغور، ملک و قوم اور زمانہ کی دست برد سے ماورئ ہوں۔

میں گنبدِ خضریٰ کا عکس ابھارنا پڑتا ہے۔ تب نعت ہوتی ہے ورنہ تو شخصی قصائد کے دفتر موجود ہیں اور ان کا ہر مبالغہ آفرین شعر، نعت ہو سکتا ہے، محدود سے لامحدود میں داخل ہونے والے اشعار میرے خیال میں آفاقی تو قرار دیے جا سکتے ہیں نعت کے نہیں۔ نعت گوئی کے ضمن میں خود جناب کشفی اپنی ایک نعت میں کچھ شرائط یوں عائد کر رہے ہیں:

ذہن کو اپنے سجالوں تو ترا نام لکھوں
اپنے لمحوں کو اجالوں تو ترا نام لکھوں
شہرِ طیبہ میں گزاری ہوئی ہر ساعت کی
یاد کو دل میں بسالوں تو ترا نام لکھوں
گنبدِ سبز کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام
اس کی تصویر بنالوں تو ترا نام لکھوں
روضۂ پاک کے نظارے کو نغمے کی طرح
روح کے ساز پہ گا لوں تو ترا نام لکھوں
میرے مولاؐ، تری کملی سے ابھرتا سورج
اس کو آئینہ بنا لوں تو ترا نام لکھوں
تیری برکت سے منور ہوئیں، جن کی آنکھیں
ان کے لہجے کو نبھالوں تو ترا نام لکھوں
خواجۂ وسعتِ افلاک و زمیں تجھ پہ سلام
تیری لو دل میں بڑھا لوں تو ترا نام لکھوں

احقر نے اس ضمن میں اپنے ایک فاضل دوست (پروفیسر میاں محمد یعقوب) سے استفسار کیا، ان کا جواب درج ذیل ہے:

جناب ابوالخیر کشفی کی علمیت اور نبیِ رحمت ﷺ سے ان کی محبت اور عقیدت ہر شک و ریب سے بالا ہے لیکن جب وہ فرماتے ہیں کہ "شعر جب محدود سے لامحدود میں داخل ہوتا ہے تو نعت کا شعر ہو جاتا ہے" تو تمام تر ادب و احترام اور تمام ممکنہ پہلوؤں پر غور کرنے کے باوجود اختلاف کیے بغیر رہا نہیں جاتا۔

ہر وہ شعر جو محدود سے لامحدود میں داخل ہوتا ہے "سحر" تو ہوتا ہے نعت نہیں یا ہم اسے زماں و مکاں سے ماورائی آفاقی شاعری کہہ سکتے ہیں۔ اردو، فارسی، عربی، ہندی اور دُنیا کی ہر زبان میں ایسے اشعار موجود ہوتے ہیں (اگرچہ کم کم) جو رنگ و نسل، حدود و ثغور، ملک و قوم اور زمانہ کی دست برد سے ماورائی ہوں۔

ہم ان اشعار کو ہر گز نعت کے اشعار نہیں کہہ سکتے۔ نعت کے اشعار صرف وہی ہوں گے جو عمداً ارادتاً اور ختمی مرتبت ﷺ پر ایمان اور محبت و عقیدت میں وارفتہ ہو کر کہے گئے ہوں۔

ہاں، اس بات کو اگر یوں کہا جائے کہ پست اور حضور ﷺ کی شان سے فروتر اشعار اگرچہ وہ ارادتاً نعت ہی میں کہے گئے ہوں انھیں "نعت" کے اشعار کے طور پر شمار نہیں کرنا چاہیے بلکہ نعت کے صرف انھی اشعار کو "نعت کے اشعار" کہنا چاہیے جو "محدود سے لامحدود" میں داخل ہوتے ہوئے دکھائی دیں۔ عامیانہ، سوقیانہ، مبتذل اور فرومایہ اشعار کو یہ شرف نہیں دیا جا سکتا تو بات زیادہ درست ہوگی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ یہ جناب سیّد ابوالخیر کشفی کے اپنے احساس کی طہارت، فکر کی صالحیت اور سوچ کی عظمت ہے کہ انھیں "میں" نہیں، "تو ہی تو" دکھائی دیتا ہے، اور ہر آفاقی خیال، ان کے تصور کی رعنائی کو اسی ہالے میں لے جاتا ہے جہاں ظاہری اور باطنی حسن کے معیار کا ہر ضابطہ اپنے منتہائے کمال پر پہنچ کر ہم آہنگ ہو گیا ہے۔ وہ خود ایک مقام پر اپنے بارے میں لکھتے ہیں... جہاں تک شاعری کا تعلق ہے، اچھے شعر اور مصرعے مجھے نہ جانے کن دنیاؤں اور فضاؤں میں پہنچا دیتے ہیں۔ اچھی شاعری ایک چہار سمتی مکالمہ ہوتی ہے۔ شاعر کا مکالمہ اپنی ذات کے ساتھ، اس کائنات کے ساتھ اور دوسرے انسانوں کے ساتھ☆[۲۶] مسلمان شاعر کے سلسلے میں یوں کہنا چاہیے کہ اپنے رب اور اپنے رسول ﷺ کے ساتھ۔ جس طرح اقامتِ صلوٰۃ کا ذکر اکثر مقامات پر ایتائے زکواۃ کے ساتھ آیا ہے۔ اسی طرح اطاعت اللہ اور اطاعت رسول ﷺ ہم ردیف ہیں۔ آدمی جب بھی محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے۔ اللہ کے تصور اور خیال سے ہم کنار ہو جاتا ہے، اسی سفر میں وہ جوار رحمۃ للعالمین ﷺ میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

نگاہ ہے یارسول اللہ ﷺ نگاہ ہے

اس کے سینے میں آہ اور آرزو ہے۔ یہ آرزو اور یہ تمنا بے ساختہ پیدا ہوتی ہے اور لامحدود کی طرف سفر، لامحدود میں اپنے محدود وجود کو گم کرنے کی آرزو اور یوں خود لامحدود ہونے کی تمنا، ہر حقیقی فن کار کی تمنا ہوتی ہے فکر اور فن کی دنیا میں عالمِ حقیقی اور عالمِ مجازی کی سرحدیں مل جاتی ہیں۔ وہ شعر جسے بہت سے صاحبان "بازاری" شعر قرار دیتے آئے ہیں، ذرا اس کے امکانات پر غور کیجیے:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

ہمارے اساتذہ یا بالخصوص ہائی اسکول کے اساتذہ تقریباً ہر شعر کے حقیقی اور مجازی معانی بتاتے تھے اور ہم لوگ زیرِ لب مسکراتے تھے۔ لیکن زندگی کا بڑا حصہ شعر و ادب کے ایوانوں میں گزارنے کے بعد ان کی حکمت اور نظر کا قائل ہونا پڑا ہے۔☆[۲۷]

جہاں تک نعت گوئی کا تعلق ہے ہم سب لکھتے بھی ہیں اور کہتے بھی کہ یہ تلوار کی دھار پر چلنا ہے مگر (الا

ماشاء اللہ) سمجھتے بہت کم ہیں کہ تلوار کی دھار پر چلنا ہے کیا؟ اگر تیز دھار پر فی الواقع چلنا پڑے تو رہرو کئی بار سوچے گا، خود کو جانچے گا، دھار کی تیزی کو دیکھے گا، تصور ہی تصور میں لڑکھڑائے گا کہ ایک واضح خوف اور ایک عیاں خطرہ پیش نظر ہے۔ یہی صورت نعت گوئی کی ہے۔ اگر نعت گو، توصیف کو حد سے بڑھا دے گا تو توہین ہوگی، شایان شان مدحت نہ کرسکے گا تو اعمال کا حسن مٹی ہوجائے گا اور مقام رسالت مآب ﷺ کیا ہے؟ کون سمجھے اور کون سمجھائے، ایک ذرہ، خورشید عالم تاب کی تابانیوں کے احاطے کا دعویٰ کیسے کرسکتا ہے؟ لاہور کا مست الست شاعر ساغر صدیقی عالم مدہوشی میں کس درجہ ہوش کی بات کر گیا ہے۔

''نعت میرے نزدیک تعریف رسالت ﷺ کا وہ طریقہ ہے جس میں الفاظ زبان سے نہیں، پلکوں سے چنے جاتے ہیں۔ منصور وشمس سے مجھ تک یہ نعمت عظمیٰ کیسے پہنچی؟ چشمِ عقیدت کے لیے اس کا جواب سرمد کے قطرہ ہائے خون اور شہباز کا نعرہ مستانہ ہی دے سکتے ہیں۔ میں نعت کہتے ہوئے اپنے جسم اور روح کو جہنم کے شعلوں سے ڈرا لیتا ہوں''

بیدل تو مجھ جیسے غیر شاعر کو بھی حمد و نعت کا اندازہ یوں سکھا گیا ہے:

زلاف حمد و نعت اولیٰ ست برخاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن، درودے می تواں گفتن

نماز، حمد کا شرعی انداز ہے، عبد مجبور کا واحد سہارا اور عبد شکور کا واحد فخر ہے اور جب جبینوں سے سجدوں کا نور چھن جائے گا تب نظام کائنات بھی تلپٹ ہوجائے گا۔ درود، نعت کی بہترین شکل اور عقیدت کا خوب صورت اظہار ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جو حضور ﷺ سے ہمارے تعلق خاطر کا پتا دیتا ہے۔ درود مصور حقیقی کے اس اجمل، احسن اور اکمل شاہ کار کی توصیف ہے جو رسالت مآب ﷺ کی شکل میں ہمیں عطا ہوا، چاہنے والا کسی شہ کار فن کی قیمت ادا نہ کرسکتا ہو تو اسے داد دینے کا فن سیکھ لینا چاہیے۔ داد کا فن آجائے تو اَن مول سے اَن مول شاہ کار بغیر قیمت کے بھی مل جایا کرتا ہے۔

اور جناب ڈاکٹر خورشید رضوی نعت گوئی کے بارے میں کیسی عارفانہ بات کہہ گئے ہیں:

شان ان ﷺ کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

''تلوار کی اس دھار پر چلنے'' کے لیے توحید و رسالت کا سچا شعور مطلوب ہے گویا... ''قدموں کو توحید کی قوت اور جذبۂ عشق رسول ﷺ اس تلوار پر مستقیم اور سلامت رکھتا ہے''...انسان ''صادق'' ﷺ کے نقوش پا کی چاندنی تک پہنچ جائے تو تمام صداقتیں، اس کی ذات اور اس کے کلمات کا نشان امتیاز بن جائیں گی

ماشاء اللہ) سمجھتے بہت کم ہیں کہ تلوار کی دھار پر چلنا ہے کیا؟ اگر تیز دھار پر فی الواقع چلنا پڑے تو رہرو کئی بار سوچے گا، خود کو جانچے گا، دھار کی تیزی کو دیکھے گا، تصور ہی تصور میں لڑکھڑائے گا کہ ایک واضح خوف اور ایک عیاں خطرہ پیش نظر ہے۔ یہی صورت نعت گوئی کی ہے۔ اگر نعت گو، توصیف کو حد سے بڑھا دے گا تو توہین ہوگی، شایانِ شان مدحت نہ کر سکے گا تو اعمال کا حسن مٹی ہوجائے گا اور مقام رسالت مآب ﷺ کیا ہے؟ کون سمجھے اور کون سمجھائے، ایک ذرہ، خورشید عالم تاب کی تابانیوں کے احاطے کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے؟ لاہور کا مست الست شاعر ساغر صدیقی عالم مدہوشی میں کس درجہ ہوش کی بات کر گیا ہے۔

''نعت میرے نزدیک تعریف رسالت ﷺ کا وہ طریقہ ہے جس میں الفاظ زبان سے نہیں، پلکوں سے چنے جاتے ہیں۔ منصور وشمس سے مجھ تک یہ نعت عظمیٰ کیسے پہنچی؟ چشمِ عقیدت کے لیے اس کا جواب سرمد کے قطرہ ہائے خون اور شہباز کا نعرہ مستانہ ہی دے سکتے ہیں۔ میں نعت کہتے ہوئے اپنے جسم اور روح کو جہنم کے شعلوں سے ڈرا لیتا ہوں''

بیدل تو مجھ جیسے غیر شاعر کو بھی حمد و نعت کا اندازہ یوں سکھا گیا ہے:

زلاف حمد و نعت اولیٰ ست برخاک ادب خفتن
سجودے می تواں کردن، درودے می تواں گفتن

نماز، حمد کا شرعی انداز ہے، عبد مجبور کا واحد سہارا اور عبد شکور کا واحد فخر ہے اور جب جبینوں سے سجدوں کا نور چھن جائے گا تب نظام کائنات بھی تلپٹ ہوجائے گا۔ درود، نعت کی بہترین شکل اور عقیدت کا خوب صورت اظہار ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جو حضور ﷺ سے ہمارے تعلق خاطر کا پتا دیتا ہے۔ درود مصور حقیقی کے اس اجمل، احسن اور اکمل شاہ کار کی توصیف ہے جو رسالت مآب ﷺ کی شکل میں ہمیں عطا ہوا، چاہنے والا کسی شہ کار فن کی قیمت ادا نہ کر سکتا ہو تو اسے داد دینے کا فن سیکھ لینا چاہیے۔ داد کا فن آجائے تو اَن مول سے اَن مول شاہ کار بغیر قیمت کے بھی مل جایا کرتا ہے۔

اور جناب ڈاکٹر خورشید رضوی نعت گوئی کے بارے میں کیسی عارفانہ بات کہہ گئے ہیں:

شان ان ﷺ کی سوچیے اور سوچ میں کھو جایئے
نعت کا دل میں خیال آئے تو چپ ہو جایئے

''تلوار کی اس دھار پر چلنے'' کے لیے توحید و رسالت کا سچا شعور مطلوب ہے گویا... ''قدموں کو توحید کی قوت اور جذبۂ عشق رسول ﷺ اس تلوار پر مستقیم اور سلامت رکھتا ہے''... انسان ''صادق'' ﷺ کے نقوش پا کی چاندنی تک پہنچ جائے تو تمام صداقتیں، اس کی ذات اور اس کے کلمات کا نشان امتیاز بن جائیں گی اور سب سے بڑی صداقت کی معرفت بھی وہیں سے ملے گی، یہی عرفان مقصود سفر بھی ہے اور مقصود نظر بھی۔ یقین کا محور بھی اور ایمان کی منزل بھی۔ حضور ﷺ کی سچی عقیدت سے عقیدے کو بال و پر ملتے ہیں اور خاکی انسان کو زمین ہی پر معراج نصیب ہوجاتی ہے۔ تب انسان آیت الٰہی بن جاتا ہے اور اس کے ''علم کو جذبے کی زبان مل جاتی ہے'' اور یہ ادبی، علمی اور فکری ضیا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم عطا بھی جب کہ نعت اس عطا کا شاعرانہ اظہار اور تحدیث نعمت کی ایک نغماتی شکل۔ المیہ یہ ہے کہ آج عقیدت کے دعوے تو ہیں مگر غیرت سے تہی ہیں۔ محبت کا ادعا تو ہے مگر اطاعت سے بے نیاز ہے۔ نہ سوئے گردوں، نالۂ شبگیر بھیجنے کا شعور، نہ رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرنے کا شعار، نہ نشاط آہ سحر، نہ وقار دست دعا اور 'ہجومِ عاشقاں' ہے کہ دور نعت گوئی کی شاعرانہ دوڑ میں شریک ہے۔ جگر ایسے ہی باتخلص حضرات کو ''کاریگرانِ شعر'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ نعت کہنے سے پہلے اپنا محاسبہ ضروری ہے لازم ہے کہ... مالک حرف و نوا سے تاب گویائی کی دعا کی جائے اور سرورِ اعظم ﷺ سے ہنر اور جمال فن کی بھیک مانگی جائے، یوں کشکول گدائی خزینہ اسلوب بن سکتا ہے۔[☆۲۸]

پروفیسر جعفر بلوچ کے الفاظ میں:

ادب شرط ہے، یہ سخن عامیانہ نہیں ہے
یہ ہے نعت کوئی غزل یا فسانہ نہیں ہے
قلم سر جھکاتا ہے اپنا درِ مصطفیٰ ﷺ پر
یہاں بات کوئی سخن گسترانہ نہیں ہے

المیہ یہ ہے کہ آج کے نعت گو احباب کی اکثریت غزل کے زور پر شعر کہہ رہی ہے۔ قرآن و حدیث سے نعت گوئی کے لیے نہ روشنی لے رہی ہے نہ رہنمائی، صحابہ کرامؓ کی نعت گوئی کے تیور بھی ان کے سامنے نہیں۔ شمائل ترمذی کے مطالعے تک سے بھی وہ محروم ہیں اور خاصان بارگاہ کے اسلوب توصیف سے بھی وہ کم کم شناسا ہیں۔ مجھے یہ لکھنے کی اجازت دیجیے کہ صرف غزل کے مرجع کو بدل کر اور فقط ''دور نعت'' کے نعت گو شعرا میں شامل ہونے کے لیے نعت کہی جارہی ہے۔ نتیجہ معلوم کہ بیشتر نعتیں، شعری اعتبار سے قدما سے بلند مگر گداز فکر کے لحاظ سے فروتر ہیں... حضور ﷺ کے عہد مبارک میں صحابہؓ کی شاعری کا عام انداز یہی ہے کہ وہ اسلام کی برکات اور عقائد کے فیوض کا رشتہ ذکر رسول ﷺ سے جوڑتے ہیں۔ میں آج بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہادیٔ برحق ﷺ کا کوئی مداح ان کے پیغام سے سرسری نہیں گزر سکتا۔ ہاں پیغام کے ساتھ پیغام بر کی ذات و صفات کو مرکز خیال بنانا لازم ہے، عالم انسانیت پر حضور ﷺ کے احسانات کا تذکرہ بھی اور اس جمال حیات افروز تک پہنچنے کی تمنا بھی ضروری ہے۔[☆۲۹]

بہ قولِ فیض:

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرف تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

آج کل نعت گوئی زیادہ تر غزل کی ہیئت میں ہورہی ہے۔ نظم گو شعرا کے مقابلے میں غزل کہنے والوں کی کثرت بھی ہے دوسرے یہ ہیئت بوجوہ موزوں بھی ہے کہ غزل ایک جاندار صنف سخن ہے۔ وہ ققنس کی طرح اپنی ہی خاکستر سے بال و پر پیدا کرتی رہی ہے۔ اس کا حسن ہمیشہ ہی شاداب و شگفتہ رہا ہے اور حوادث زمانہ اسے کجلانے اور دُھندلانے میں ناکام رہے ہیں کہ یہ ادب کی حیات مستقلہ ہے، یہ ایک نغماتی فکر ہے یہ اردو کی آبرو ہے۔ یہ کائنات کی وسعتوں کو ناپ سکتی ہے۔ دل گداختہ اسے جنم دیتا، ذہن کی پختگی اسے سنوارتی اور تخیل کی رفعت تاثر عطا کرتی ہے، اس کا ہر شعر آہ کی طرح اُٹھتا، آنسو کی طرح گرتا اور تیر کی طرح دل میں ترازو ہوجاتا ہے۔ یہ ان رموز و اسرار کی سچی عکاس ہے جو ذرے سے خورشید تک اور دامانِ باغباں سے کف گل فروش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شیر افضل جعفری کے الفاظ میں:

نطق پلکوں پہ شرر ہو تو غزل ہوتی ہے
آستیں آگ سے تر ہو تو غزل ہوتی ہے
داغ سلگے تو مہک اُٹھتا ہے بستان گداز
آہ میں بوئے اگر ہو تو غزل ہوتی ہے
ہر طرف زیست کی راہوں میں بچھے ہوں کانٹے
اور پھر عزم سفر ہو تو غزل ہوتی ہے
مدت عمر ہے مطلوب ریاضت کے لیے
زندگی بار دگر ہو تو غزل ہوتی ہے
ہاتھ لگتے ہیں فلک ہی سے مضامیں اکثر
دل میں جبریل کا پر ہو تو غزل ہوتی ہے
قاب قوسین کی، ارمان پیمبر ﷺ کی قسم
حسن چلمن کے ادھر ہو تو غزل ہوتی ہے

قبل ازیں کشفی کا ''تغزل آشنا'' قلم چلمن سے متعلق کلیتاً غزل کے ایک شعر کے لامحدود امکانات کا جائزہ لے چکا ہے۔ شیر افضل جعفری کے آخری شعر پر غور کیجیے، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، حق یہ ہے کہ خیال وفکر کا تقدس، غزل کے علائم و رموز کو حسن، رنگ اور نور کی ایک دنیا عطا کرجاتا ہے اور... آج کے بہترین

بہ قولِ فیض:

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک
ہر حرفِ تمنا ترے قدموں کی صدا ہے

آج کل نعت گوئی زیادہ تر غزل کی ہیئت میں ہو رہی ہے۔ نظم گو شعرا کے مقابلے میں غزل کہنے والوں کی کثرت بھی ہے دوسرے یہ ہیئت بوجوہ موزوں بھی ہے کہ غزل ایک جاندار صنفِ سخن ہے۔ وہ ققنس کی طرح اپنی ہی خاکستر سے بال و پر پیدا کرتی رہی ہے۔ اس کا حسن ہمیشہ ہی شاداب و شگفتہ رہا ہے اور حوادثِ زمانہ اسے کجلانے اور دُھندلانے میں ناکام رہے ہیں کہ یہ ادب کی حیاتِ مستقلہ ہے، یہ ایک نغماتی فکر ہے یہ اردو کی آبرو ہے۔ یہ کائنات کی وسعتوں کو ناپ سکتی ہے۔ دلِ گداختہ اسے جنم دیتا، ذہن کی پختگی اسے سنوارتی اور تخیل کی رفعت تاثر عطا کرتی ہے، اس کا ہر شعر آہ کی طرح اُٹھتا، آنسو کی طرح گرتا اور تیر کی طرح دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔ یہ ان رموز و اسرار کی سچی عکاس ہے جو ذرے سے خورشید تک اور دامانِ باغباں سے کفِ گل فروش تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شیر افضل جعفری کے الفاظ میں:

نطق پلکوں پہ شرر ہو تو غزل ہوتی ہے
آستیں آگ سے تر ہو تو غزل ہوتی ہے
داغ سلگے تو مہک اُٹھتا ہے بستانِ گداز
آہ میں بوئے اگر ہو تو غزل ہوتی ہے
ہر طرف زیست کی راہوں میں بچھے ہوں کانٹے
اور پھر عزمِ سفر ہو تو غزل ہوتی ہے
مدتِ عمر ہے مطلوب ریاضت کے لیے
زندگی بار دگر ہو تو غزل ہوتی ہے
ہاتھ لگتے ہیں فلک ہی سے مضامیں اکثر
دل میں جبریل کا پر ہو تو غزل ہوتی ہے
قاب قوسین کی، ارمان پیمبر ﷺ کی قسم
حسن چلمن کے ادھر ہو تو غزل ہوتی ہے

قبل ازیں کشفی کا ''تغزل آشنا''، قلم چلمن سے متعلق کلیتاً غزل کے ایک شعر کے لامحدود امکانات کا جائزہ لے چکا ہے۔ شیر افضل جعفری کے آخری شعر پر غور کیجیے، بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی، حق یہ ہے کہ خیال وفکر کا تقدس، غزل کے علائم و رموز کو حسن، رنگ اور نور کی ایک دنیا عطا کر جاتا ہے اور... آج کے بہترین نعت گو وہی شاعر ہیں جنھوں نے غزل کی صنف کو مسخر کیا اور اس میں اپنے ہنر کو تسلیم کرایا۔☆[30] یہ ایک حقیقت ہے کہ... فارسی اور اردو کی مقبول ترین صنف غزل ہے، غزل اپنے اختصار کے ساتھ ساتھ اس وجہ سے بھی مقبول ہوئی کہ اس کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہے اور یہ اکائیاں مل کر اس وحدت کی تعمیر کرتی ہیں جسے ہم غزل کہتے ہیں پھر ایک شعر میں جہانِ معنی آباد نظر آتا ہے۔ غزل کا ہر شعر ہمارے ذہن کی وادیوں میں اپنا مسکن بنالیتا ہے اور اس کے مفہوم میں نت نئے پہلو پیدا ہوتے رہتے ہیں... غزل کے سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ صورت میں یہ قصیدہ کا نقش ثانی ہے۔☆[31]

... غزل بڑی کافر صنفِ سخن ہے جو کسی مصلحت کے در پر اپنے مزاج اور اداؤں کو قربان نہیں کرتی، لیکن درِ خیرالوریٰ پر آ کر سجدۂ تسلیم و رضا بجا لاتی ہے کہ اس کی گل بدنی کو وہ گل فضا مل جاتی ہے جس کے بغیر وہ مکمل نہ تھی۔☆[32]

اس لیے نعت میں یہ ضروری ہے کہ غزل کے علائم و رموز، فنی اعتبار سے یوں برتے جائیں کہ ان میں رنگ و نور کی ایک قوسِ قزح جھلکے اور معنوی نقطۂ نظر سے محبت ابھرے، اطاعت سنورے اور تقدس نکھرے، کہیں بھی غزل کے روایتی انداز کا شائبہ نہ آئے۔ غزل کو باوضو بنانے کے لیے شاعر کی اپنی زندگی کا صالح ہونا ضروری ہے اگر یہ صالحیت نصیب نہ ہو تو نعت کہنے کے بجائے مبدءِ فیض کے حضور میں سراپا دعا بن جانا چاہیے۔ اس عطا کے بغیر نعت، غزل ہی کی صدائے بازگشت ہوگی جو گنبدِ خضریٰ کی ناراضی کا سبب بن کر حسنِ اعمال کو غارت کر دے گی اور یہ شاعر کی فکری عظمت اور شعری ندرت ہوگی اگر وہ غزل کی علامتوں کو نعت میں یوں استعمال کرے کہ ان میں انوار کی ایک دنیا سمٹ جائے اور یہ علامتیں ''نئی معنویت'' حاصل کرلیں۔ غزل کے ڈھنگ اور آہنگ کو اپنانے سے نعت ایک ''سیارۂ نور'' اور ''شرارِ معنوی'' بن جاتی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ... غزل کے نظامِ علائم و رموز پر تصوف کا سایہ ہے اور یوں محدود سے لامحدود کی طرف سفر ان علامتوں کے ذریعے سہل ہو جاتا ہے لامحدود کی طرف شاعر کا سفر اس کی تقدیر بھی ہے اور شعر کا مقدر بھی۔☆[33] حق یہ ہے کہ شعورِ فن سے خلوصِ فن تک کے مرحلے انتہائی جاں گداز ہوتے ہیں۔ غزل گو عموماً فکر و خیال کی بے نام وادیوں میں بے مقصد گھومتا رہتا ہے۔ محبوب بھی فرضی سا ہوتا ہے اور آدابِ محبت بھی تصوراتی اور اظہارِ محبت بھی مبالغہ آمیز مگر نعت میں محبوب ﷺ متعین ہے اس کا حسن، رخِ جمالِ الٰہی کا آئینہ، اس کا عمل، ہر دور کے ہر تقاضے کے لیے ہدایت کی ابدی مشعل، اس سے ہماری ہر زندگی کی ہر آبرو وابستہ، اس کی رحمت، دل کی ہر افسردگی کی شگفتگی کا سبب، اس لیے یہاں قدم قدم احترام اور قلم قلم احتیاط کی ضرورت ہے یہاں نہ اشہبِ فکر بے لگام ہوسکتا ہے اور نہ راہوارِ قلم، بگٹٹ۔ یہ ایک فنی اور فکری پل صراط ہے اور یہاں سے وہی سلامتی سے گزر سکتا ہے جسے حق نے قلبِ سلیم سے نواز رکھا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہر قادرالکلام شاعر، نعت گوئی پر قادر نہیں

ہوا کرتا... غزل اور دوسرے اصناف سخن کا انتخاب خالص ادبی بنیادوں پر ممکن ہے۔ زبان کی برجستگی، مضمون کی صفائی، ندرت خیال، کسی نئے گوشے، کسی نئے اظہار کی بنا پر اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن نعت کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیوں کہ نعت محض صنف سخن نہیں، بلکہ اپنے رسول ﷺ سے ہم امتیوں کے تعلق کا اظہار ہے اور اس اظہار کی سطحیں، تہیں اور پہلو بے شمار ہیں۔☆[۳۴] غزل ایک حرف شیریں اور استعارہ رقصاں ہے۔ غزل کے پہلے اہم شاعر شیخ سعدی نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا اور انھوں نے غزل میں ''رقیق، نازک، شیریں اور پردرد الفاظ استعمال کیے ہیں'' (شبلی) اردو کے نعت گوشعرا کی اکثریت نے نعت کے لیے غزل کی ہیئت کا انتخاب اسی بنا پر کیا ہے کہ ان کی نعت حدیث دل بن جائے شاید بلکہ یقیناً کسی بھی مذہب کے ماننے والوں میں سے انفرادی طور پر ہر ایک فرد کا رشتہ اپنے رسول کے ساتھ وہ نہیں ہے جو ہر مسلمان کا رشتہ ہادیٔ برحق اور انیس بے کساں حضرت محمد ﷺ سے ہے، غزل کے آہنگ میں لکھی ہوئی نعتیں اس ذاتی اور شخصی رشتہ کو بڑی حد تک پیش کرتی ہیں، غزل کا عشقیہ لہجہ بڑا امتحان ہے اور یہ تلوار کی دھار پر سفر ہے، مبارک ہیں وہ لفظ شناس جو اپنے سلیقہ و ادب کی بنا پر سلامتی سے اس راہ سے گزر جاتے ہیں۔☆[۳۵]

جناب کشفی کے خیال میں غزل کی ہیئت، علامات اور اشارات کو جب ایک نعت گو، گداز فکر سے ہم آہنگ کرتا ہے تو وہ ''غزل کے پیکر کو قبائے نور عطا کرتا ہے'' گویا نعت لفظوں کو ویسے ہی جگمگا دیتی ہے جس طرح حضور ﷺ کی ایک نگہ لطف، مس خام کو کندن بنا دیتی ہے...نعت میں غزل کی علامتوں کا سیاق و سباق نہیں بلکہ منظر و پیش منظر اور معنوی سطح تک... ہر چیز بدل جاتی ہے جس طرح حضور ﷺ کی نظر دلوں کی دنیا بدل دیتی تھی۔اس طرح ان ﷺ کا ذکر لفظوں کی سطح اور معانی کو بدل کر نئی بلندیاں عطا کر دیتا ہے۔☆[۳۶]

زندگی کے ہر مرحلے، وقت کی ہر گردش، فیصلے کی ہر گھڑی، قلم کی ہر حرکت اور دل کی ہر دھڑکن میں اللہ تعالیٰ کی برتری مسلم رہنی چاہیے، وہی کارساز، وہی کارکشا، وہی غالب، وہی کار آفرین اور اللہ تعالیٰ کے بعد حضور ﷺ کی عظمت پیش نظر رہے اس غالب و کارآفرین تک پہنچنے اور اسے پانے کے لیے حضور ﷺ کی اطاعت لازم ہے جوش عقیدت میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اختیارات میں شریک کر لینا، کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے نعت کے لیے جب بھی قلم اٹھے تو توحید و رسالت کا فرق واضح انداز میں سامنے رہنا چاہیے اور نعت کو حمد نہیں بننا چاہیے۔ جس طرح ایک عام بشر کی تعریف اگر مبالغے کو چھو جائے تو بقول جناب کشفی وہ خیرالبشر ﷺ کی تعریف بن جاتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں خودبخود نعت ہوجاتی ہے کہ ''موضوع بدل جائے تو قدیم و مستعمل علائم و رموز بھی ایک نئی فضا تخلیق کر دیا کرتے ہیں'' اسی طرح اگر حضور ﷺ کی مدحت مقرر حد سے بڑھ جائے تو وہ خودبخود حمد کے دائرے میں پہنچ جائے گی، جسے شرعی اور ادبی اعتبار سے تعریف نہیں، تنقیص کہا جائے گا اور قلم شرک کا مرتکب

ہوا کرتا... غزل اور دوسرے اصنافِ سخن کا انتخاب خالص ادبی بنیادوں پر ممکن ہے۔ زبان کی برجستگی، مضمون کی صفائی، ندرت خیال، کسی نئے گوشے، کسی نئے اظہار کی بنا پر اشعار کا انتخاب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن نعت کے ساتھ یہ معاملہ نہیں کیوں کہ نعت محض صنف سخن نہیں، بلکہ اپنے رسول ﷺ سے ہم امتیوں کے تعلق کا اظہار ہے اور اس اظہار کی سطحیں، تہیں اور پہلو بے شمار ہیں۔☆[۳۴] غزل ایک حرف شیریں اور استعارہ رقصاں ہے۔ غزل کے پہلے اہم شاعر شیخ سعدی نے یہ نکتہ سمجھ لیا تھا اور انھوں نے غزل میں ''رقیق، نازک، شیریں اور پردرد الفاظ استعمال کیے ہیں'' (شبلی) اردو کے نعت گو شعرا کی اکثریت نے نعت کے لیے غزل کی ہیئت کا انتخاب اسی بنا پر کیا ہے کہ ان کی نعت حدیث دل بن جائے شاید بلکہ یقیناً کسی بھی مذہب کے ماننے والوں میں سے انفرادی طور پر ہر ایک فرد کا رشتہ اپنے رسول کے ساتھ وہ نہیں ہے جو ہر مسلمان کا رشتہ ہادیٔ برحق اور انیس بے کساں حضرت محمد ﷺ سے ہے، غزل کے آہنگ میں لکھی ہوئی نعتیں اس ذاتی اور شخصی رشتہ کو بڑی حد تک پیش کرتی ہیں، غزل کا عشقیہ لہجہ بڑا امتحان ہے اور یہ تلوار کی دھار پر سفر ہے، مبارک ہیں وہ لفظ شناس جو اپنے سلیقہ و ادب کی بنا پر سلامتی سے اس راہ سے گزر جاتے ہیں۔☆[۳۵]

جناب کشفی کے خیال میں غزل کی ہیئت، علامات اور اشارات کو جب ایک نعت گو، گداز فکر سے ہم آہنگ کرتا ہے تو وہ ''غزل کے پیکر کو قبائے نور عطا کرتا ہے'' گویا نعت لفظوں کو ویسے ہی جگمگا دیتی ہے جس طرح حضور ﷺ کی ایک نگہ لطف، مس خام کو کندن بنا دیتی ہے... نعت میں غزل کی علامتوں کا سیاق و سباق نہیں بلکہ منظر و پیش منظر اور معنوی سطح تک... ہر چیز بدل جاتی ہے جس طرح حضور ﷺ کی نظر دلوں کی دنیا بدل دیتی تھی۔ اس طرح ان ﷺ کا ذکر لفظوں کی سطح اور معانی کو بدل کر نئی بلندیاں عطا کر دیتا ہے۔☆[۳۶]

زندگی کے ہر مرحلے، وقت کی ہر گردش، فیصلے کی ہر گھڑی، قلم کی ہر حرکت اور دل کی ہر دھڑکن میں اللہ تعالیٰ کی برتری مسلم رہنی چاہیے، وہی کارساز، وہی کارکشا، وہی غالب، وہی کار آفرین اور اللہ تعالیٰ کے بعد حضور ﷺ کی عظمت پیش نظر رہے اس غالب و کارآفرین تک پہنچنے اور اسے پانے کے لیے حضور ﷺ کی اطاعت لازم ہے جوش عقیدت میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اختیارات میں شریک کرلینا، کسی طور بھی مناسب نہیں ہے۔ اس لیے نعت کے لیے جب بھی قلم اٹھے تو توحید و رسالت کا فرق واضح انداز میں سامنے رہنا چاہیے اور نعت کو حمد نہیں بننا چاہیے۔ جس طرح ایک عام بشر کی تعریف اگر مبالغے کو چھو جائے تو بقول جناب کشفی وہ خیرالبشر ﷺ کی تعریف بن جاتی ہے۔ یا دوسرے لفظوں میں خود بخود نعت ہو جاتی ہے کہ ''موضوع بدل جائے تو قدیم و مستعمل علائم و رموز بھی ایک نئی فضا تخلیق کر دیا کرتے ہیں'' اسی طرح اگر حضور ﷺ کی مدحت مقرر حد سے بڑھ جائے تو وہ خود بخود حمد کے دائرے میں پہنچ جائے گی، جسے شرعی اور ادبی اعتبار سے تعریف نہیں، تنقیص کہا جائے گا اور قلم شرک کا مرتکب ہو جائے گا، صرف نعت ہی کے لیے نہیں بلکہ ایمان کی تکمیل کے لیے بھی حضور ﷺ سے والہانہ نوعیت کی قلبی وابستگی ضروری ہے اور... یہ وابستگی ایسی صراط مستقیم ہونی چاہیے کہ نعت گو ایک طرف تو توحید کے باب میں غیرت مند ہو اور اپنے رب کی احدیت پر کسی کا سایہ نہ پڑنے دے تو دوسری طرف مقام رسالت ﷺ کا ایسا شناسا ہو کہ ہر تصور، ہر عقیدہ اور ہر دوسری ذات کو اسی ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے حوالے سے دیکھے۔☆[۳۷]

فیض پھر یاد آ گئے:

ہر صبح گلستاں ہے ترا روئے بہاریں
ہر پھول تری یاد کا نقش کف پا ہے

رسول اکرم ﷺ ہر اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے انوار و فیوض کا مظہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں احسن گفتار، اجمل رفتار اور اکمل کردار سے یوں نواز رکھا ہے کہ جتنا غور کرتے چلے جائیں ؛خیر کثیر'' کی نوازشیں اور وسعتیں کھل کر اور کھل کر سامنے آتی چلی جاتی ہیں۔ دست فطرت کے اس عظیم و جلیل شاہکار کو دیکھنے کا یارا کسی کسی کو ملتا ہے حسن نظر اور توفیق نظر بھی حسن آفرین ہی کی دین ہے ورنہ ہر آنکھ سزاوار نظارہ نہیں ہوتی، جناب کشفی قرآن پاک کی اس آیت **قدجاء کم من اللّٰہ نور و کتاب مبین** (المائدہ) کی روشنی میں جب اقبال کے ان اشعار:

ہر کجا بینی جہان رنگ و بو
آنکہ از خاکش بروید آرزو
یاز نور مصطفیٰ ﷺ اورا بہاست
یا ہنوز اندر تلاش مصطفیٰ ﷺ ست

تک پہنچتے ہیں تو ان کا قلم ایک صدرنگ کہکشاں ابھارتا، سنوارتا اور نکھارتا چلا جاتا ہے کہ ان کی سوچ کی سچائی اور شعور کی زیبائی پر ایک رشک سا آتا ہے لکھتے ہیں... حضور نبیٔ کریم ﷺ کے حسن جاوداں اور حسن ہمہ جہت کو دیکھنے والوں نے اپنے ظرف کے مطابق دیکھا، جمالِ یار پر نظر کا ٹھہرنا ہی کیا آسان ہے...؟ معاملہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی وہ جمال پھول بن جاتا ہے اور کبھی رخسار اور رخساروں میں سورج تیرتے نظر آتے ہیں، حسن، حجاب نظر بن جاتا ہے مگر یوں کہ حسن کا ایک نیا پہلو سامنے آجاتا ہے۔ کبھی ''ہجوم لالہ و گل''، کبھی ''خندۂ برق و شرر'' آپ شمائل مصطفوی ﷺ کا مطالعہ فرمائیں تو یہی عالم نظر آئے گا، اپنے اپنے ذوق، آرزو اور احوال و ظرف کے مطابق۔ قرآن مجید نے حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ ﷺ کو ''نور'' قرار دیا ہے۔ نور اپنے وجود' پر آپ دلالت کرتا ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ کی زندگی ایک معجزہ اور دلالت نبوت ہے۔ اس زندگی کا ہر لمحہ ایسا روشن اور واضح ہے کہ اس کی روشنی کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لیے کسی

اور روشنی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضور ﷺ ہماری زندگی کا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہیں کہ ہم اشیا کو ان ﷺ کے نور میں دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اشیا ہمیں ان ﷺ کے حضور لے جاتی ہیں۔ چیزوں کو اسی نور سے بہا حاصل ہے یا پھر چیزیں اسی کی تلاش میں مصروف ہیں، حضور ﷺ کا نور ہر شے کے مقام کا تعین کرتا ہے:

فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسم بلالؓ و طرز بولہبی

سروری صرف اس ذات بے ہمتا کو زیبا ہے اور ہر سجدۂ بندۂ مومن اسی کے لیے مخصوص ہے لیکن حضور ﷺ کے قرب و جوار میں جیسے سر میں ایک سجدہ مچلنے لگتا ہے اور الحمدللہ کہ فرزانگی، توحید اور شریعت کے آداب، اس سجدۂ بے تاب کو روک کر اس جذبے کو ہماری ذات کی شناخت بنا دیتے ہیں:

نہ سر سے جدا ہو، نہ کھل کر ادا ہو
اک ایسا بھی بے تاب سجدہ ہے سر میں [۳۸]

نعت، اسی سجدۂ بے تاب کی شعری ادائی ہے، یہ ایک عبادت ہے بے سجدہ و قیام، نعت کہتے ہوئے شاعر خود کو انوار کے ایک دلنواز ہالے میں محسوس کرتا ہے اور فی الواقع اسے کائنات حضور ﷺ ہی کے فروغ حسن سے جگمگاتی نظر آتی ہے اور ذات و کائنات کی حقیقتیں اور شناختیں اسی روشنی میں واضح ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ درج بالا آیت میں لفظ ''نور'' سے جناب کشفی، حضور ﷺ کی ذات پرنور مراد لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قرآن پاک مراد لیا ہے۔ بہرکیف قرآن ہو یا صاحبؐ قرآن، دونوں ایسے اجالے ہیں جن سے جہل و تعصب، شرک و کفر کے اندھیرے اور قلب و نظر کی تاریکیاں یوں کافور ہوجاتی ہیں جیسے سورج کی پہلی کرن، شب کی ظلمتوں کو نگل جاتی ہے۔ یہی نور بھٹکے ہوئے ذہنوں اور سرگرداں عقل کو راستہ ہی نہیں دکھاتا بلکہ ایک روشن منزل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ دونوں، اجالوں کا ایک ایسا سلسلہ ہیں جو روز بروز روشن تر ہوتا چلا جارہا ہے اور اس خوش نصیب کے کیا کہنے جو ''حضور ﷺ کے وسیلے سے کائنات سے رشتہ قائم کرتا اور کائنات کے واسطے سے حضور ﷺ سے یہ تعلق پیدا کرتا ہے۔'' [۳۹]

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی ﷺ تو ہو

جہاں تک نعت میں رسول پاک ﷺ کے ظاہری حسن و جمال کے تذکرے کا تعلق ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر تصور و وجدان پر ہے یا سراپائے اقدس کے تذکروں کو اپنے خیال میں سجا لینے سے ہے، یا پھر غزل کی تشبیہات کو مبالغہ عطا کرکے لامحدود فضاؤں میں داخل کرنے کی سعی سے ہے۔ ہاں اگر کسی کو زیارت حضور ﷺ خواب میں نصیب ہوجائے... مگر وہ بھی ہزار کوشش کے باوجود، کچھ بھی نہ کہہ سکے گا بلکہ اسے

اور روشنی اور دلیل کی ضرورت نہیں۔ حضور ﷺ ہماری زندگی کا ایک ایسا مرکزی نقطہ ہیں کہ ہم اشیا کو ان ﷺ کے نور میں دیکھتے ہیں اور دوسری طرف اشیا ہمیں ان ﷺ کے حضور لے جاتی ہیں۔ چیزوں کو اسی نور سے بہا حاصل ہے یا پھر چیزیں اسی کی تلاش میں مصروف ہیں، حضور ﷺ کا نور ہر شے کے مقام کا تعین کرتا ہے:

فروغ حسن سے تیرے چمک گئی ہر شے
ادائے رسم بلالیؓ و طرز بولہبی

سروری صرف اس ذات بے ہمتا کو زیبا ہے اور ہر سجدۂ بندۂ مومن اسی کے لیے مخصوص ہے لیکن حضور ﷺ کے قرب و جوار میں جیسے سر میں ایک سجدہ مچلنے لگتا ہے اور الحمدللہ کہ فرزانگی، توحید اور شریعت کے آداب، اس سجدۂ بے تاب کو روک کر اس جذبے کو ہماری ذات کی شناخت بنا دیتے ہیں:

نہ سر سے جدا ہو، نہ کھل کر ادا ہو
اک ایسا بھی بے تاب سجدہ ہے سر میں ☆[۳۸]

نعت، اسی سجدۂ بے تاب کی شعری ادائی ہے، یہ ایک عبادت ہے بے سجدہ و قیام، نعت کہتے ہوئے شاعر خود کو انوار کے ایک دلنواز ہالے میں محسوس کرتا ہے اور فی الواقع اسے کائنات حضور ﷺ ہی کے فروغ حسن سے جگمگاتی نظر آتی ہے اور ذات و کائنات کی حقیقتیں اور شناختیں اسی روشنی میں واضح ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔ درج بالا آیت میں لفظ ''نور'' سے جناب کشفی، حضور ﷺ کی ذات پرنور مراد لیتے ہیں۔ بعض مفسرین نے قرآن پاک مراد لیا ہے۔ بہرکیف قرآن ہو یا صاحبِ قرآن، دونوں ایسے اجالے ہیں جن سے جہل و تعصب، شرک و کفر کے اندھیرے اور قلب و نظر کی تاریکیاں یوں کافور ہوجاتی ہیں جیسے سورج کی پہلی کرن، شب کی ظلمتوں کو نگل جاتی ہے۔ یہی نور بھٹکے ہوئے ذہنوں اور سرگرداں عقل کو راستہ ہی نہیں دکھاتا بلکہ ایک روشن منزل کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ یہ دونوں، اجالوں کا ایک ایسا سلسلہ ہیں جو روز بروز روشن تر ہوتا چلا جارہا ہے اور اس خوش نصیب کے کیا کہنے جو ''حضور ﷺ کے وسیلے سے کائنات سے رشتہ قائم کرتا اور کائنات کے واسطے سے حضور ﷺ سے یہ تعلق پیدا کرتا ہے۔'' ☆[۳۹]

ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھی ﷺ تو ہو

جہاں تک نعت میں رسول پاک ﷺ کے ظاہری حسن و جمال کے تذکرے کا تعلق ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر تصور و وجدان پر ہے یا سراپائے اقدس کے تذکروں کو اپنے خیال میں سجا لینے سے ہے، یا پھر غزل کی تشبیہات کو مبالغہ عطا کرکے لامحدود فضاؤں میں داخل کرنے کی سعی سے ہے۔ ہاں اگر کسی کو زیارت حضور ﷺ خواب میں نصیب ہوجائے... مگر وہ بھی ہزار کوشش کے باوجود، کچھ بھی نہ کہہ سکے گا بلکہ اسے آئینہ سامنے رکھ کر اپنی ہی آنکھوں کو چومنے کے پاکیزہ شغل سے فرصت ہی نہیں ملے گی اور تمام عمر سپاس وشکر کے انھی سجدوں میں تمام ہوجائے گی، تب ثابت ہوجائے گا کہ اس حسن جہانتاب کے کسی بھی رخ کا احاطہ کوئی سا لفظی پیرایہ بھی نہیں کرسکتا، وہ نطق کو سکتے میں پائے گا اور ادراک و خرد کو کلیتاً مجبور کہ... ☆[۴۰]

سرکار ﷺ جس خواب میں آئیں، وہ خواب بیداریوں کی بیداری ہوتا ہے۔ وسواس و گمان سے بالاتر صحابہ کرامؓ کی آنکھیں ہر لحظہ چہرۂ رسالت مآب ﷺ پر مرکوز رہتی تھیں مقصود نظر وہی ایک چہرہ مبارک ہوتا تھا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان ﷺ کے وصال کی خبر سے ایک صحابیؓ نے اپنی بینائی کے چھن جانے کی دعا کی تھی کہ اب وہ رعنائی روپوش ہوگئی ہے جس سے بصارت کو بصیرت کے اُجالے ملتے تھے۔ ان صحابہ کرامؓ نے بھی اپنی نعتیہ شاعری میں صوری جمال سے زیادہ کمال سیرت پر زور دیا ہے، کیوں کہ نعت کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ سیرت کا جو کمال ہمارے پاس ہے، وہ منکرین مکہ کے پاس نہیں ہے، انکسار کا جو افتخار ادھر ہے اس سے عمائدین مکہ کی رعونتیں محروم ہیں۔ جو انوار مدینہ میں ہیں ان سے کفارِ مکہ کے گرد و پیش بے نصیب ہیں اور توصیف رسالت ﷺ میں جو رعنائیاں ہیں ان سے اہلِ مکہ کی تعلّیانہ خودنمائیاں بے بہرہ ہیں کہ نعت، کفار کی لسانی گستاخیوں کے جواب کے لیے وجود میں آئی تھی۔ اس میں خود ممدوح بے مثال ﷺ کی رضا اور دعا شامل تھی جب کہ روح القدس کی تائید کو احتراماً اور اصولاً شامل ہونا پڑا تھا۔ نعت کے اسلوب اور اصول بھی اس زبان صدق اظہار نے متعین فرمائے تھے جس کی صداقت میں نہ ماضی شبہ کرسکتا تھا نہ حال اور نہ مستقبل کرسکے گا۔ عربی قصائد کا آغاز، فرضی یا کسی حد تک حقیقی محبوب کی ظاہری ستائش سے ہوتا تھا جسے تشبیب کہتے ہیں اور شاعر گریز کے بعد اصل مقصد کی طرف آیا کرتا تھا۔ اس قدیم شعری روش کے باوصف اس دور کی نعتیہ شاعری میں سیرت کا ذکر زیادہ ہے اور حق یہ ہے کہ وہی چہرہ نظر افروز ہوتا ہے جو غازۂ جاں کی بدولت گلگوں اور شفق رنگ ہوتا ہے۔ گویا نعت گوئی کا مقصد اولیٰ سیرت کے تذکرے کو عام کرکے، سامعین و قارئین کی سیرت کا رخ بدلنا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی انداز آج کے شاعر کے لیے آسان بھی ہے اور قابلِ عمل بھی۔ اگر وہ حسن ظاہر کے تذکروں میں پڑ جائے گا تو لازماً کہیں نہ کہیں غزل کا مجازی رنگ راہ پا کر بات کو یوں بے کیف کردے گا کہ:

ذکر احمد ﷺ سے ہے یوں کرنوں کی بارش روح پر
جیسے کوئی ماہ پیکر جھانکتا ہو بام سے

اور یہ ایک عام بات ہے کہ مشبہ بہ کو مشبہ کے مقابلے میں کامل تر ہونا چاہیے۔ اس نوع کی بازاری تشبیہات سے نعت کا جمال مجروح ہوتا ہے اور یہ ایک واضح صداقت ہے کہ شعر و ادب کے خزینوں میں کون سی تشبیہ ایسی ہے جو اس وجود ناز کی رعنائیوں کے لیے لائی جاسکتی ہے جس پر خود حسن آفرین کو ناز ہو۔

دورِ حاضر کی نعتوں میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جو معنوی لحاظ سے قابلِ گرفت ہیں۔ اہل نظر کا اولین فرض ہے کہ وہ اس نوع کے اشعار پر کڑی اور بے لاگ تنقید کریں اور اس نقد و نظر پر شاعر برا نہ مانے اور نہ اسے ادبی، شخصی اور شعری انا کا مسئلہ بنائے کیوں کہ مخاطب وہ ذات والا صفات ﷺ ہے جس کے حضور میں سانس بھی ہولے سے لینا چاہیے، بہتر ہے کہ وہاں دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہ آئے اور صرف آنسو ترجمان دل بے قرار بن جائیں، چہ جائیکہ کوئی کہے کہ ''آ میں تجھے آئینہ دکھاؤں'' کوئی انھیں ''عظیم تر'' کہہ کر ''عظیم ترین'' کے انتظار کے بارے میں مجبور کر رہا ہو۔ کوئی مدینے کی گلیوں میں ''ناچنے'' کو فخر گردانتا ہو۔ یاد رہے کہ '' آئینہ دکھانا'' محاورہ ہے، برائی یا بھلائی کے سلسلے میں کسی کی حقیقت اس پر ظاہر کرنا اور ''ناچنا'' وہاں جہاں جنیدؒ بایزیدؒ بھی نفس گم کردہ آتے ہیں؟ نعت میں لفظ اور مفہوم ہر دو واضح ہونے چاہئیں، وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے، یہاں نہ لفظی ابہام چلتا ہے نہ معنوی ابہام اس نوع کی نشان دہی ضروری ہے۔ ورنہ کسی نہ کسی حالی کو دورِ حاضر کی نعتیہ شاعری کی تطہیر کے لیے اٹھنا پڑے گا۔ بصورتِ دیگر ستائش باہمی کی انجمنوں کو گنبد خضریٰ کی ناراضی کا یہاں بھی سامنا کرنا پڑے گا اور وہاں بھی جہاں ان ﷺ کی رحمۃ للعالمینی ہی ہر ایک کا واحد سہارا ہوگی نعت، برائے بیت کہنے سے بہتر ہے کہ سکوت ہی کو تکلم بلیغ سمجھا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ نہ ہر باتخلص شاعر ہوسکتا ہے اور نہ ہر شاعر، نعت گو۔ یہ تو کرم کے فیصلے اور نصیب کی باتیں ہیں۔ جناب کشفی نے اپنی تحریروں میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ دورِ حاضر کے نعت گو شعرا کو محاسن سیرت اور صحابہ کرامؓ کی عملی محبت کے تذکرۂ جمیل کو موضوع سخن بنانا چاہیے کہ ''اللہ تعالیٰ کا شاہکار محمد عربی ﷺ ہیں تو ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ شاہکار رسالت ﷺ ہیں''☆[41] اور یہ بھی ضروری ہے کہ...اپنے آپ کو حسانؓ اور کعبؓ قرار دینے والے شاعروں کو بلند بانگ دعوے کرنے کی جگہ، ان کے قدموں میں بیٹھ کر نعت کے آداب سیکھ لینا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ کے انداز کی شاعری اسی وقت ممکن ہے جب ہماری زندگی اور فکر کے تضادات ختم ہوجائیں۔ صحابہ کرامؓ سے نعت گوئی کے آداب جس طرح بوصیریؒ، سعدیؒ، جامیؒ و قدسیؒ اور اقبالؒ و ظفر علی خاںؒ نے سیکھے، اسے سامنے رکھ کر ہی سفینۂ نعت آگے اور آگے گہرے پانیوں میں سفر کرسکتا ہے۔☆[42] یاد رہے کہ... دورِ صحابہؓ کی شاعری میں واقعات کے ذکر کے ساتھ نبیٔ کریم ﷺ کی مدح ملتی ہے، صحابہ کرامؓ زندگی کو حضور ﷺ کے حوالے سے دیکھتے تھے اور حضور ﷺ کو زندگی کے حوالے سے یاد کرتے تھے۔☆[43] الغرض خوئے رسالت ﷺ اور خوش بوئے رسالت ﷺ ہی اس دور کی نعتیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضور ﷺ ہر اعتبار سے کامل اور ان کے سچے متبعین بہر نوع عظیم کہ ان کی محراب عظمت میں تاریخ کا ہر شرف دوزانو دکھائی دیتا ہے۔ انسان سازی ایک پیغمبرانہ مشن ہے اور نعت گوئی کا بنیادی مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ دور حاضر سیرت کی خوش بو سے مہک اٹھے اور انسان فرشِ خاک پر رہتے ہوئے ''فلک مرتبت'' قرار پائے اور زمانے کی گردشیں اس کی دہلیز پر پہنچ کر رک جائیں اور ہوا کی موجیں اس کے آستانے کو بوسہ دے کر

دورِ حاضر کی نعتوں میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جو معنوی لحاظ سے قابلِ گرفت ہیں۔ اہل نظر کا اولین فرض ہے کہ وہ اس نوع کے اشعار پر کڑی اور بے لاگ تنقید کریں اور اس نقد و نظر پر شاعر برانہ مانے اور نہ اسے ادبی، شخصی اور شعری انا کا مسئلہ بنائے کیوں کہ مخاطب وہ ذات والا صفات ﷺ ہے جس کے حضور میں سانس بھی ہولے سے لینا چاہیے، بہتر ہے کہ وہاں دل کے دھڑکنے کی بھی آواز نہ آئے اور صرف آنسو ترجمان دل بے قرار بن جائیں، چہ جائیکہ کوئی کہے کہ ''آ میں تجھے آئینہ دکھاؤں'' کوئی انھیں ''عظیم تر'' کہہ کر ''عظیم ترین'' کے انتظار کے بارے میں مجبور کر رہا ہو۔ کوئی مدینے کی گلیوں میں ''ناچنے'' کو فخر گردانتا ہو۔ یاد رہے کہ ''آئینہ دکھانا'' محاورہ ہے، برائی یا بھلائی کے سلسلے میں کسی کی حقیقت اس پر ظاہر کرنا اور ''ناچنا'' وہاں جہاں جنیدؒ و بایزیدؒ بھی نفس گم کردہ آتے ہیں؟ نعت میں لفظ اور مفہوم ہر دو واضح ہونے چاہئیں، وضاحت کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے، یہاں نہ لفظی ابہام چلتا ہے نہ معنوی ایہام اس نوع کی نشان دہی ضروری ہے۔ ورنہ کسی نہ کسی حالی کو دورِ حاضر کی نعتیہ شاعری کی تطہیر کے لیے اٹھنا پڑے گا۔ بصورتِ دیگر ستائش باہمی کی انجمنوں کو گنبد خضریٰ کی ناراضی کا یہاں بھی سامنا کرنا پڑے گا اور وہاں بھی جہاں ان ﷺ کی رحمۃ للعالمینی ہی ہر ایک کا واحد سہارا ہوگی نعت، برائے بیت کہنے سے بہتر ہے کہ سکوت ہی کو تکلم بلیغ سمجھا جائے اور یہ مان لیا جائے کہ نہ ہر باتخلص شاعر ہوسکتا ہے اور نہ ہر شاعر، نعت گو۔ یہ تو کرم کے فیصلے اور نصیب کی باتیں ہیں۔ جناب کشفی نے اپنی تحریروں میں جابجا اس امر پر زور دیا ہے کہ دورِ حاضر کے نعت گو شعرا کو محاسن سیرت اور صحابہ کرامؓ کی عملی محبت کے تذکرۂ جمیل کو موضوع سخن بنانا چاہیے کہ ''اللہ تعالیٰ کا شاہکار محمد عربی ﷺ ہیں تو ابوبکرؓ و عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ شاہکار رسالت ﷺ ہیں''☆[۴۱] اور یہ بھی ضروری ہے کہ... اپنے آپ کو حسانؓ اور کعبؓ قرار دینے والے شاعروں کو بلند بانگ دعوے کرنے کی جگہ، ان کے قدموں میں بیٹھ کر نعت کے آداب سیکھ لینا چاہیے۔ صحابہ کرامؓ کے انداز کی شاعری اسی وقت ممکن ہے جب ہماری زندگی اور فکر کے تضادات ختم ہوجائیں۔ صحابہ کرامؓ سے نعت گوئی کے آداب جس طرح بوصیریؒ، سعدیؒ، جامیؒ و قدسیؒ اور اقبالؒ و ظفر علی خاںؒ نے سیکھے، اسے سامنے رکھ کر ہی سفینۂ نعت آگے اور آگے گہرے پانیوں میں سفر کرسکتا ہے۔☆[۴۲] یاد رہے کہ... دورِ صحابہؓ کی شاعری میں واقعات کے ذکر کے ساتھ نبیٔ کریم ﷺ کی مدح ملتی ہے، صحابہ کرامؓ زندگی کو حضور ﷺ کے حوالے سے دیکھتے تھے اور حضور ﷺ کو زندگی کے حوالے سے یاد کرتے تھے۔☆[۴۳] الغرض خوئے رسالت ﷺ اور خوش بوئے رسالت ﷺ ہی اس دور کی نعتیہ شاعری کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضور ﷺ ہر اعتبار سے کامل اور ان کے سچے متبعین بہر نوع عظیم کہ ان کی محراب عظمت میں تاریخ کا ہر شرف دوزانو دکھائی دیتا ہے۔ انسان سازی ایک پیغمبرانہ مشن ہے اور نعت گوئی کا بنیادی مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ دور حاضر سیرت کی خوش بو سے مہک اٹھے اور انسان فرشِ خاک پر رہتے ہوئے ''فلک مرتبت'' قرار پائے اور زمانے کی گردشیں اس کی دہلیز پر پہنچ کر رک جائیں اور ہوا کی موجیں اس کے آستانے کو بوسہ دے کر گزریں کہ:

جس سے ملی ہے منزل عرفان و آگہی
وہ ایک موج نور اسی رہ گزر میں ہے
ایسا بلند کردیا انسان کا مقام
چرخ بریں بھی حلقۂ دام بشر میں ہے
تابندہ جس نے کردیا بخت سیاہ کو
وہ گوہر کرم مرے داماں تر میں ہے

نعت میں بعض شاعر عالم محبت یا عالم محویت میں اور بعض ارادتاً ''یا'' کا ندائیہ لفظ استعمال کرتے ہیں جس سے بعض جبینوں پر شکنیں ابھر آتی ہیں۔ انھیں فی الواقع توحید کے آبگینے کی نزاکت اور استعانت کے حقیقی مرکز و محور کا خیال ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ عالم کیف میں جن خاصان بارگاہ کی ''فغان زیرلب'' بے ساختہ پکار کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ ان پر نقد و نظر کرنے سے پہلے ناقد کو اپنے دل کی کیفیتوں کو ٹٹولنا ہوگا۔ کیوں کہ جب تک ایک ناقد خود کو شاعر کی دنیائے احساس میں نہ لے جائے وہ صحیح انداز میں نقد نہیں کرسکتا۔ اگر کسی خوش نصیب کے دل کے آئینے میں اس عظیم الشان انسان ﷺ کے حسن عالم تاب کی جھلک ہو اور اس پرتو پرنور نے اسے ذات و کائنات سے بے نیاز کر رکھا ہو اور اس کا پورا وجود ہی ایک ''سرگوشی'' بن گیا ہو تو تنقید سے کہیں بہتر ہے کہ اس کیف نشاط کی آرزو کی جائے۔ ایک اللہ والے (حضرت مولانا عبدالہادی دین پوریؒ) کی بارگاہ میں کچھ علمائے کرام بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک نے حضور ﷺ کے حاضر و ناظر ہونے کے بارے میں استفسار کیا۔ آپ نے بات ٹالی۔ ادھر سے اصرار بڑھا تو آپ کے منہ سے یہ جملہ نکلا کہ ''حضور ﷺ سے جسے جتنا تعلق خاطر ہے حضور ﷺ اس کے لیے اتنے ہی حاضر و ناظر ہیں'' اللہ والوں کی باتوں کے پس پردہ بصیرت افروز بصارت لو دیا کرتی ہے۔ ہمارے بیش تر مذہبی جھگڑے، قلبی تعلق کے فقدان کی دلیل ہیں۔ سوئی، مقناطیس کے قریب ہونا ہی نہ چاہے تو یہ اس کی کم نصیبی ہے۔ ذرے، تابش خورشید سے ٹکرائیں گے تو خود چاند بن کر طباشیری کرنیں بکھیریں گے۔ جناب کشفی ہشام علی حافظ کے نعتیہ کلام ''یا حبیبی ﷺ یارسول اللہ'' ﷺ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''یہ نام محض کتاب کا نام نہیں بلکہ ایک سرگوشی ہے... سارے وجود کی سرگوشی... ایک فغان زیرِ لب ہے جو ہونٹوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتی یہاں ''یا'' کے استعمال میں استمداد اور استعانت نہیں بلکہ ایک امتی کا تخاطب ہے جو دل کی گہرائیوں میں اس ذاتِ گرامی ﷺ کو موجود پاتا ہے، وہ ذات جو اساس ایمان ہے اور آج بھی ہر اُمتی کے لیے حاضر بھی ہے اور غائب بھی۔ نظروں سے غائب مگر فکر و شعور و آگاہی میں تو انا قوت کی طرح موجود''☆[۴۳]

نعت میں ''تو'' اور ''تم'' کے لفظی استعمال کو بعض لوگ سوئے ادب سمجھتے ہیں ان کی نیت راست ہے۔ جب کہ ''آپ'' کہیں بہتر لفظ ہے۔ بعض فنی مجبوریاں بھی ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح ''یثرب'' کے لفظ کا استعمال ہے جسے خود حضور ﷺ نے پسند نہیں فرمایا مگر یہ لفظ استعمال ہورہا ہے۔ ماضی میں بعض ثقہ اور معتبر شخصیات نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ اس کی جگہ ''طیبہ'' کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی عروضی روک نہیں ہے۔ حضور ﷺ کو خطاب کرنے کے سلسلے میں خود قرآن مجید میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس ضمن میں جناب کشفی کا تعلق خاطر ''تو'' کے لفظ میں کہیں زیادہ قربت اور انس محسوس کرتا ہے۔ یہ لفظ انھیں ''ادب اور شاعری کی دنیا میں ایک زندہ اور توانا لفظ نظر آتا ہے ایسا لفظ جو روایات اور معانی کی ایک دنیا ہے''☆[۴۴] اسی نکتے کو وہ ایک اور مقام پر یوں واضح کرتے ہیں... پاکستان کے ایک نہایت اچھے نعت گو اپنے اس نظریہ کا خاصے تشدد سے پرچار کرتے ہیں کہ امام الانبیا ﷺ کے لیے ''تو'' اور ''تم'' کی ضمیریں استعمال کرنا گستاخی ہے۔ اس رائے کو قبول کرنا بہت مشکل ہے ''تو'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ اس کی وحدت کا اشارہ ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی نبیوں میں ان کی یکتائی کے پیش نظر مستعمل ہے۔ پھر اس لفظ میں جو قربت اور محبت ہے وہ کسی اور خطابیہ لفظ میں نہیں۔ ہاں جسے گستاخی کا پرتو نظر آئے اس کے لیے ''تو'' اور ''تم'' سے مکمل اجتناب لازم ہے۔☆[۴۵] یاد رہے کہ... کوئی لفظ خود بے قدر یا کم قدر نہیں ہوتا۔ اسے اعتبار نسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ ابوبکرؓ کو صدیقؓ، عمرؓ کو فاروق، عثمانؓ کو غنی اور علیؓ کو باب العلم کس نے بنایا؟ اسی نسبت نے اور یہی نسبت ''تو'' کو ہماری زبان کا سب سے معتبر لفظ بنا دیتی ہے۔ حضور ﷺ سے ہمارا تعلق محض ضابطہ کا نہیں یہ تعلق تو نغمۂ روح اور حدیث شہ رگ ہے۔ اس قربت کے بار کو ''تو'' کا لفظ ہی سہار سکتا ہے یہی لفظ اس ربّ جلیل سے ہمارے تعلق کے اظہار کی اساس بنتا ہے جو رگ جاں سے بھی قریب تر ہے۔☆[۴۶]

ایک اور مقام پر کشفی لکھتے ہیں کہ... یہ لفظ صرف اللہ اور رسول ﷺ کی نسبت سے ہماری زبان کا سب سے زیادہ محترم لفظ ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی یہ اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ خاصان محمد ﷺ نے اپنے رسول ﷺ، اپنے آرام جاں ﷺ اور اپنے محبوب ﷺ کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظوں کے معنی محض لغت یا اپنے وہم اور مذاق میں تلاش نہ کیجیے زندگی اور زبان کے عام اور زندہ استعمال میں تلاش کیجیے لفظ ''تو'' دانہ گوہر یکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسول عربی ﷺ کی نسبت سے جس نے بھی ''تو'' کی یکتائی کو سمجھا، اسے عشق یکتا سے نواز دیا گیا۔ محض وعظ ہو یا سیرت کی کتاب، ہم نبیٔ کریم ﷺ کی ذات فلک مرتبت کے لیے ''آپ'' کا لفظ اور بہت سے القاب و آداب استعمال کرتے ہیں۔ سرورِ کونین، ختمیِ مرتبت، سیّدِ کل، خیرالبشر، رسول اعظم، ہادیٔ برحق، صاحبِ کوثر ﷺ وغیرہ وغیرہ لیکن جب تخلیقی لمحوں میں ہمارا جذبِ دروں ہمیں عشق کے پر لگا کر اُڑاتا ہے اور جب یہ بزمِ کائنات ہمارے لیے بدل جاتی ہے تو یہ سارے القاب، یہ آداب، یہ سارے لفظ، ایک لفظ میں بدل جاتے ہیں ''تو'' میں۔ یہ چھوٹا سا یک رکنی

نعت میں ''تو'' اور ''تم'' کے لفظی استعمال کو بعض لوگ سوئے ادب سمجھتے ہیں ان کی نیت راست ہے۔ جب کہ ''آپ'' کہیں بہتر لفظ ہے۔ بعض فنی مجبوریاں بھی ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح ''یثرب'' کے لفظ کا استعمال ہے جسے خود حضور ﷺ نے پسند نہیں فرمایا مگر یہ لفظ استعمال ہورہا ہے۔ ماضی میں بعض ثقہ اور معتبر شخصیات نے بھی اسے استعمال کیا ہے۔ حالاں کہ اس کی جگہ ''طیبہ'' کا لفظ استعمال کرنے میں کوئی عروضی روک نہیں ہے۔ حضور ﷺ کو خطاب کرنے کے سلسلے میں خود قرآن مجید میں واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس ضمن میں جناب کشفی کا تعلق خاطر ''تو'' کے لفظ میں کہیں زیادہ قربت اور انس محسوس کرتا ہے۔ یہ لفظ انھیں ''ادب اور شاعری کی دنیا میں ایک زندہ اور توانا لفظ نظر آتا ہے ایسا لفظ جو روایات اور معانی کی ایک دنیا ہے''☆[۴۴] اسی نکتے کو وہ ایک اور مقام پر یوں واضح کرتے ہیں... پاکستان کے ایک نہایت اچھے نعت گو اپنے اس نظریہ کا خاصے تشدد سے پرچار کرتے ہیں کہ امام الانبیا ﷺ کے لیے ''تو'' اور ''تم'' کی ضمیریں استعمال کرنا گستاخی ہے۔ اس رائے کو قبول کرنا بہت مشکل ہے ''تو'' کا لفظ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے کہ اس کی وحدت کا اشارہ ہے اور حضور ﷺ کے لیے بھی نبیوں میں ان کی یکتائی کے پیش نظر مستعمل ہے۔ پھر اس لفظ میں جو قربت اور محبت ہے وہ کسی اور خطابیہ لفظ میں نہیں۔ ہاں جسے گستاخی کا پرتو نظر آئے اس کے لیے ''تو'' اور ''تم'' سے مکمل اجتناب لازم ہے۔☆[۴۵] یاد رہے کہ... کوئی لفظ خود بے قدر یا کم قدر نہیں ہوتا۔ اسے اعتبار نسبت سے حاصل ہوتا ہے۔ ابوبکرؓ کو صدیقؓ، عمرؓ کو فاروق، عثمانؓ کو غنی اور علیؓ کو باب العلم کس نے بنایا؟ اسی نسبت نے اور یہی نسبت ''تو'' کو ہماری زبان کا سب سے معتبر لفظ بنا دیتی ہے۔ حضور ﷺ سے ہمارا تعلق محض ضابطہ کا نہیں یہ تعلق تو نغمۂ روح اور حدیث شہ رگ ہے۔ اس قربت کے بار کو ''تو'' کا لفظ ہی سہار سکتا ہے یہی لفظ اس ربّ جلیل سے ہمارے تعلق کے اظہار کی اساس بنتا ہے جو رگ جاں سے بھی قریب تر ہے۔☆[۴۶]

ایک اور مقام پر کشفی لکھتے ہیں کہ... یہ لفظ صرف اللہ اور رسول ﷺ کی نسبت سے ہماری زبان کا سب سے زیادہ محترم لفظ ہے۔ عشقیہ شاعری میں بھی یہ اپنا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ خاصان محمد ﷺ نے اپنے رسول ﷺ، اپنے آرام جاں ﷺ اور اپنے محبوب ﷺ کے لیے مسلسل یہ لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظوں کے معنی محض لغت یا اپنے وہم اور مذاق میں تلاش نہ کیجیے زندگی اور زبان کے عام اور زندہ استعمال میں تلاش کیجیے لفظ ''تو'' دانہ گوہر یکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ رسول عربی ﷺ کی نسبت سے جس نے بھی ''تو'' کی یکتائی کو سمجھا، اسے عشق یکتا سے نواز دیا گیا۔ محض وعظ ہو یا سیرت کی کتاب، ہم نبیٔ کریم ﷺ کی ذات فلک مرتبت کے لیے ''آپ'' کا لفظ اور بہت سے القاب و آداب استعمال کرتے ہیں۔ سرورِ کونین، ختمیِ مرتبت، سیّدِ کل، خیرالبشر، رسول اعظم، ہادیٔ برحق، صاحبِ کوثر ﷺ وغیرہ وغیرہ لیکن جب تخلیقی لمحوں میں ہمارا جذبِ دروں ہمیں عشق کے پر لگا کر اُڑاتا ہے اور جب یہ بزمِ کائنات ہمارے لیے بدل جاتی ہے تو یہ سارے القاب، یہ آداب، یہ سارے لفظ، ایک لفظ میں بدل جاتے ہیں ''تو'' میں۔ یہ چھوٹا سا یک رکنی لفظ کائنات کا سب سے محترم اور مقدس لفظ بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے دل کی دھڑکن بن جاتا ہے۔ یہ ہماری خلوتوں کا آئینہ بن جاتا ہے۔ وہ خلوت جس میں جمالِ مصطفیٰ ﷺ ہوتا ہے اور ہماری حیرانی۔ یہ ہمارے اختیار کی نہیں، سپردگی کی منزل ہوتی ہے۔☆[۴۷]

الغرض نعت گوئی، اللہ تعالیٰ کا خاص کرم اور حضور ﷺ کے التفات کا ایک دل آویز نتیجہ ہے اور اس عطا پر شاعر جس قدر بھی شکر ادا کرے کم ہے۔ مگر اس اظہار سپاس میں کسی پہلو سے بھی فخر کا شائبہ نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ فخر ہی سے کبر و عجب کو غذا ملتی ہے۔ جب کہ نعت گوئی بنیادی طور پر ''عطا'' کی بات ہے اس لیے کہ بڑائی معطی ہی کو زیب دیتی ہے اور ایسے شاعر خوش نصیب ہیں جنھیں نعت گوئی کی توفیق عطا ہوئی ہو۔ حمد و ثنا نیلے آسمان والے اور درود و سلام سبز گنبد میں سونے والے ﷺ کے لیے اور سلامتی کی دعا، ان ﷺ کی توصیف و ثنا کو شعری پیرہن دینے والے کے لیے... سلام ان گلیوں پر جو آج بھی حضور ﷺ کے نقش کف پا کے سورج اپنے ذروں میں چھپائے ہوئے ہیں اور سلام اس دنیا پر کہ ان ﷺ سے پہلے تیرہ خاکدان تھی اور جب وہ آئے تو عالم امکان بن گئی۔☆[۴۸]

اور اب آخر میں جناب کشفی کے نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' کے بارے میں احقر کا اوّلین تاثر دیکھیے جو مدیر ''نعت رنگ'' کو ایک مکتوب کے ذریعے ۱۳ر فروری ۲۰۰۰ء کو ارسال کیا گیا تھا کہ یہ کتاب انھی کی وساطت سے ملی تھی۔

مکرمی! سلام مسنون

حافظ شیرازیؒ کے کم و بیش تمام مطبوعہ دواوین میں ایک شعر یوں ہے:

خوشا نماز و نیاز کسے کہ از سر درد
بآب دیدہ و خون جگر طہارت کرد

میرے پاس ایک قلمی دیوان حافظ تھا اس میں یہ شعر یوں نظر پڑا:

خوشا نماز نیاز کسے کہ از سر صدق
بآب دیدہ و خون جگر طہارت کرد

غور کیجیے کہ محض ایک حرف عطف کے اُٹھ جانے اور ایک لفظ کے بدل جانے سے بات کیا سے کیا ہوگئی۔ اسی ساعت ذہن میں یہ نکتہ ابھرا کہ نعت ہی وہ ''نماز نیاز'' ہے جو ادا نہیں ہوسکتی جب تک صدق دل کے ساتھ خون جگر سے کشید ہونے والے آنسوؤں سے وضو نہ کیا جائے کہ یہ درود و سلام ہی کی ایک نغماتی شکل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسندیدگی کو رسول پاک ﷺ کے اتباع سے وابستہ کر رکھا ہے اتباع، قلبی محبت ہی کا ایک عملی اظہار ہے۔ گویا حضور ﷺ کا محبّ، خدا کا محبوب اور حضور ﷺ کا مدح خواں، خدا کی پسندیدہ شخصیت ہے اور یہ وہ شرف ہے جس کے حصول کے لیے ہر آرزو قربان ہوسکتی ہے:

نعت نبی ﷺ درود ہے، نعت نبی ﷺ سلام
نعت نبی ﷺ نماز ہے بے سجدہ و قیام

اور جناب سیّد ابوالخیر کشفی نے یہ ''نماز نیاز'' جس روحانی خلوص، جس فکری تقدس، جس علمی رسوخ اور جس شعری تغزل کے ساتھ ادا کی ہے۔ وہ سراسر گنبد خضریٰ ہی کی عطا معلوم ہوتی ہے کہ:

طیبہ کی ہوا مدحت سرکار ﷺ کی قاصد
ان ﷺ کا نہ اشارہ ہو تو ہم کچھ نہیں لکھتے

جناب کشفی نے جس انداز سے ذہن کو سجایا، جس رنگ سے نعت نگاری کے لمحوں کو اجالا، جس شوق سے دیار ناز کی یادوں سے قلب ونظر کو معطر ومنور رکھا اور جس ادا سے کالی کملی کی اوٹ سے ابھرتے سورج کو شعری آئینہ بنایا وہ فی الواقع بڑے نصیب کی بات ہے جو خاصان بارگاہ ہی کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ عرفی نے ٹھیک ہی کہا تھا:

جوہر طبع من از وصف کمالت روشن
گوہر نظم من از نسبت ذاتت ممتاز

حق یہ ہے کہ نعت گوئی ہی وہ صنف سخن ہے جو فکر و خیال کی بے نام وادیوں میں بھٹکنے اور بھٹکنے والوں کی پریشان نظری کو سیر چشمی کی نعمت عطا کرتی ہے۔ یہاں نہ زیب داستان کے لیے کچھ بڑھانے کی کوئی حاجت ہے اور نہ بیان حسن کو کسی شعری صنعت کی ضرورت کہ مشبہ کے مقابلے میں ہر مشبہ بہ فروتر ہے... ہزار پھول شگفتہ اور وہ اک تبسم لب... ہزار عید کے چاند اور وہ اک رخ نظر افروز... خلاصۂ آیات محکمات بھی اور صداقت انوار بینات بھی کہ خود حسن آفرین بھی مشتاق دید نظر آتا ہے:

جو حسن میرے پیش نظر ہے اگر اسے !
جلوے بھی دیکھ لیں تو طواف نظر کریں

اور جناب سیّد ابوالخیر کشفی، ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ اس صنف سخن نے انھیں جمال نظر، جمالِ فکر اور جمالِ سخن عطا کیا ہے۔ اب اور کیا تجھے دل دیوانہ چاہیے؟

یقین کیجیے کہ ایک مدت کے بعد ایک ایسی کتاب ملی، جسے پڑھ کر درد چھلکتا اور روح مہکتی رہی اور احقر کی بے کیفیوں کو ایک طویل عرصے کے بعد کیف ملا۔ پلکوں پر ستارے لرزتے اور موتی ٹوٹتے رہے جب کہ یہ گوہر، آنکھوں میں پتھرا سے گئے تھے۔ میں جناب کشفی کا ممنون احسان ہوں کہ ان کے طفیل وہ آنسو نصیب ہوئے جن سے دل کا غبار دُھلتا اور حائل حجاب اُٹھتے ہیں۔ کہنے والے چشمِ گوہر بار کو عنایتِ

نعت نبی ﷺ درود ہے، نعت نبی ﷺ سلام
نعت نبی ﷺ نماز ہے بے سجدہ و قیام

اور جناب سیّد ابوالخیر کشفی نے یہ ''نماز نیاز'' جس روحانی خلوص، جس فکری تقدس، جس علمی رسوخ اور جس شعری تغزل کے ساتھ ادا کی ہے۔ وہ سراسر گنبد خضریٰ ہی کی عطا معلوم ہوتی ہے کہ:

طیبہ کی ہوا مدحت سرکار ﷺ کی قاصد
ان ﷺ کا نہ اشارہ ہو تو ہم کچھ نہیں لکھتے

جناب کشفی نے جس انداز سے ذہن کو سجایا، جس رنگ سے نعت نگاری کے لمحوں کو اجالا، جس شوق سے دیار ناز کی یادوں سے قلب ونظر کو معطر ومنور رکھا اور جس ادا سے کالی کملی کی اوٹ سے ابھرتے سورج کو شعری آئینہ بنایا وہ فی الواقع بڑے نصیب کی بات ہے جو خاصان بارگاہ ہی کو نصیب ہوا کرتی ہے۔ عرفی نے ٹھیک ہی کہا تھا:

جوہر طبع من از وصف کمالت روشن
گوہر نظم من از نسبت ذاتت ممتاز

حق یہ ہے کہ نعت گوئی ہی وہ صنف سخن ہے جو فکر و خیال کی بے نام وادیوں میں بھکنے اور بھٹکنے والوں کی پریشان نظری کو سیرچشمی کی نعمت عطا کرتی ہے۔ یہاں نہ زیب داستان کے لیے کچھ بڑھانے کی کوئی حاجت ہے اور نہ بیان حسن کو کسی شعری صنعت کی ضرورت کہ مشبہ کے مقابلے میں ہر مشبہ بہ فروتر ہے... ہزار پھول شگفتہ اور وہ اک تبسم لب... ہزار عید کے چاند اور وہ اک رخ نظر افروز... خلاصۂ آیات محکمات بھی اور صداقت انوار بینات بھی کہ خود حسن آفریں بھی مشتاق دید نظر آتا ہے:

جو حسن میرے پیش نظر ہے اگر اسے !
جلوے بھی دیکھ لیں تو طواف نظر کریں

اور جناب سیّد ابوالخیر کشفی، ہدیۂ تبریک کے مستحق ہیں کہ اس صنف سخن نے انھیں جمال نظر، جمالِ فکر اور جمالِ سخن عطا کیا ہے۔ اب اور کیا تجھے دل دیوانہ چاہیے؟

یقین کیجیے کہ ایک مدت کے بعد ایک ایسی کتاب ملی، جسے پڑھ کر درد چھلکتا اور روح مہکتی رہی اور احقر کی بے کیفیوں کو ایک طویل عرصے کے بعد کیف ملا۔ پلکوں پر ستارے لرزتے اور موتی ٹوٹتے رہے جب کہ یہ گوہر، آنکھوں میں پتھرا سے گئے تھے۔ میں جناب کشفی کا ممنون احسان ہوں کہ ان کے طفیل وہ آنسو نصیب ہوئے جن سے دل کا غبار دُھلتا اور حائل حجاب اُٹھتے ہیں۔ کہنے والے چشمِ گوہربار کو عنایتِ پروردگار یوں ہی نہیں کہا کرتے۔ اسی کتاب میں ایک مقام پر تحریر ہے:

میرے اشکوں سے بنے گنبدِ خضریٰ کی شبیہ
تیری رحمت ہو عطا دیدۂ نم کی صورت

اور جب یہ آرزو شرف قبول پاتی ہے تو انکسار کا افتخار یوں ناز کرتا ہے:

ایسے عاصی بھی ہیں جو تابِ نظر رکھتے ہیں
اپنی آنکھوں میں محبت کے گہر رکھتے ہیں

جناب سیّد ابوالخیر کشفی نے احقر کو ''برادر عزیز'' لکھا ہے، ایک صاحب دل، صاحب فکر اور 'صاحب نسبت' نعت گو کے قلم سے نکلنے والے یہ ''دو لفظ'' میری حیات مستعار کا سرمایہ ہیں۔ کاش یہی سرمایہ، اس تن آساں، ناتواں، آلودہ داماں اور بے سروساماں کے لیے اخروی سرخ روئی کا باعث بن جائے کہ یہاں بھی اور وہاں بھی بات کسی نہ کسی نسبت ہی سے بنے گی۔

اُمید ہے کہ آپ مع جملہ احباب بخیر ہوں گے۔

حوالے

☆۱۔ ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری... ایک تاثر، 'نعت رنگ' ۲، ص۲۲۱
☆۲۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ۲۲
☆۳۔ دیباچہ، ارمغان جمیل (نعتیہ مجموعہ جمیل نقوی)، صفحہ۲
☆۴۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۳۸
☆۵۔ مضمون فارسی اور اردو میں نعت کی روایت، صفحہ۴۲، ۴۴، مجلّہ حضرت حسانؓ نعت ایوارڈ ۱۹۹۰ء ۔ ۱۹۹۱ء
☆۶۔ امین راحت چغتائی کی نعت گوئی، 'نعت رنگ' ۱۰، صفحہ۲۲۴، ۲۲۶
☆۷۔ دیباچہ، مدحت خیرالبشر ﷺ، راغب مرادآبادی، مطبوعہ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۷
☆۸۔ دیباچہ، مدحت خیرالبشر ﷺ، راغب مرادآبادی، مطبوعہ ۱۹۷۹ء، صفحہ۲۶
☆۹۔ دیباچہ، مدحت خیرالبشر ﷺ، راغب مرادآبادی، مطبوعہ ۱۹۷۹ء، صفحہ ۲۷
☆۱۰۔ دیباچہ، ارمغان جمیل، نعتیہ مجموعہ، جمیل نقوی، صفحہ۱۱
☆۱۱۔ دیباچہ، ارمغان جمیل، نعتیہ مجموعہ، جمیل نقوی، صفحہ ۹

☆۱۲۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۳۰

☆۱۳۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۲۲

☆۱۴۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۴۵

☆۱۵۔ دیباچہ، جادۂ رحمت، نعتیہ مجموعہ، صبیح رحمانی، ص ۱۱

☆۱۶۔ دیباچہ، جادۂ رحمت، نعتیہ مجموعہ، صبیح رحمانی، ص ۱۷

☆۱۷۔ مقامِ محمد ﷺ، السیرۃ عالمی، شمارہ ۲، ۳، ۴

☆۱۸۔ دیباچہ، سروش سدرہ، مجموعہ کلام، ارمان اکبر آبادی

☆۱۹۔ پیش گفتار، مجموعہ نعت، سیّد محمد ابوالخیر کشفی، نسبت صفحہ ۷

☆۲۰۔ افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری، طور سے حرا تک، صفحہ ۱۴

☆۲۱۔ دیباچہ نعتیہ مجموعہ ارمغان جمیل، شاعر جمیل نقوی

☆۲۲۔ دیباچہ نعتیہ مجموعہ ارمغان جمیل، شاعر جمیل نقوی

☆۲۳۔ دیباچہ، افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری، طور سے حرا تک، صفحہ ۱۶

☆۲۴۔ مقدمہ، نعتیہ مجموعہ 'اساس' سرشار صدیقی، صفحہ ۱۱

☆۲۵۔ نعت کے عناصر، مضمون، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۳۲

☆۲۶۔ ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری، 'نعت رنگ' ۲، صفحہ ۲۱۷

☆۲۷۔ نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۳۷

☆۲۸۔ امین راحت چغتائی کی نعت گوئی، 'نعت رنگ' ۱۰، صفحہ ۲۲۹

☆۲۹۔ دیباچہ مدحت خیرالبشر ﷺ، نعتیہ مجموعہ، راغب مراد آبادی، صفحہ ۲۹

☆۳۰۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۲۴

☆۳۱۔ مقالہ اردو معاشرے میں شاعری کی اہمیت

☆۳۲۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۲۷

☆۳۳۔ دیباچہ، اساس، نعتیہ مجموعہ، سرشار صدیقی، مطبوعہ ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۹

☆۳۴۔ دیباچہ، سفینۂ نعت، مسرور کیفی، مطبوعہ ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۸

☆۳۵۔ نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۴۱

☆۳۶۔ دیباچہ، رحمت لقب، اقبال صفی پوری، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۷

☆۳۷۔ دیباچہ، بصیرت، نعیم تقوی، مطبوعہ ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵

☆۳۸۔ دیباچہ، رحمت لقب، اقبال صفی پوری، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۹

☆۳۹۔ اسلامی معاشرے میں شاعری کی حیثیت

☆۱۲۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۳۰

☆۱۳۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۲۲

☆۱۴۔ غزل میں نعت کی جلوہ گری، 'نعت رنگ' ۹، صفحہ ۴۵

☆۱۵۔ دیباچہ، جادۂ رحمت، نعتیہ مجموعہ، صبیح رحمانی، ص ۱۱

☆۱۶۔ دیباچہ، جادۂ رحمت، نعتیہ مجموعہ، صبیح رحمانی، ص ۱۷

☆۱۷۔ مقامِ محمد ﷺ، السیرۃ عالمی، شمارہ ۲، ۳، ۴

☆۱۸۔ دیباچہ، سروش سدرہ، مجموعہ کلام، ارمان اکبر آبادی

☆۱۹۔ پیش گفتار، مجموعہ نعت، سیّد محمد ابو الخیر کشفی، نسبت صفحہ ۷

☆۲۰۔ افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری، طور سے حرا تک، صفحہ ۱۴

☆۲۱۔ دیباچہ نعتیہ مجموعہ ارمغان جمیل، شاعر جمیل نقوی

☆۲۲۔ دیباچہ نعتیہ مجموعہ ارمغان جمیل، شاعر جمیل نقوی

☆۲۳۔ دیباچہ، افسر ماہ پوری کی نعتیہ شاعری، طور سے حرا تک، صفحہ ۱۶

☆۲۴۔ مقدمہ، نعتیہ مجموعہ 'اساس' سرشار صدیقی، صفحہ ۱۱

☆۲۵۔ نعت کے عناصر، مضمون، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۳۲

☆۲۶۔ ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری، 'نعت رنگ' ۲، صفحہ ۲۱۷

☆۲۷۔ نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۳۷

☆۲۸۔ امین راحت چغتائی کی نعت گوئی، 'نعت رنگ' ۱۰، صفحہ ۲۲۹

☆۲۹۔ دیباچہ مدحت خیر البشر ﷺ، نعتیہ مجموعہ، راغب مراد آبادی، صفحہ ۲۹

☆۳۰۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۲۴

☆۳۱۔ مقالہ اردو معاشرے میں شاعری کی اہمیت

☆۳۲۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۲۷

☆۳۳۔ دیباچہ، اساس، نعتیہ مجموعہ، سرشار صدیقی، مطبوعہ ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۹

☆۳۴۔ دیباچہ، سفینہ نعت، مسرور کیفی، مطبوعہ ۱۹۹۰ء، صفحہ ۱۸

☆۳۵۔ نعت اور گنجینہ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۴۱

☆۳۶۔ دیباچہ، رحمت لقب، اقبال صفی پوری، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۷

☆۳۷۔ دیباچہ، بصیرت، نعیم تقوی، مطبوعہ ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵

☆۳۸۔ دیباچہ، رحمت لقب، اقبال صفی پوری، مطبوعہ ۱۹۸۸ء، صفحہ ۹

☆۳۹۔ اسلامی معاشرے میں شاعری کی حیثیت

☆۴۰۔ دیباچہ، ارمغان جمیل، جمیل نقوی صفحہ ۲

☆۴۱۔ نعت کے عناصر، 'نعت رنگ' ۵، صفحہ ۲۷

☆۴۲۔ نعت کے موضوعات 'نعت رنگ' ۶، صفحہ ۲۱

☆۴۳۔ ہشام علی حافظ کی نعتیہ شاعری، 'نعت رنگ' ۲، صفحہ ۲۱۷

☆۴۴۔ نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۲۱

☆۴۵۔ فارسی اور اردو میں نعت کی روایت، مجلّہ حضرت حسانِ نعت ایوارڈ، مطبوعہ ۱۹۹۰ء۔۱۹۹۱ء، صفحہ ۳۵

☆۴۶۔ دیباچہ سروش سدرہ، ارمان اکبر آبادی

☆۴۷۔ نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم، 'نعت رنگ' ۴، صفحہ ۵۲

☆۴۸۔ دیباچہ ارمغانِ جمیل، جمیل نقوی

پروفیسر شفقت رضوی

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی نعت شناسی

نعت گوئی اور نعت شناسی عام ذہنی سطح سے بلندتر اوصاف ہیں کہ جن کے احوال کے انکشاف کے لیے الفاظ اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرتے ہیں۔ نعت لفظوں کا کھیل نہیں جو آج کل عام طور پر جاری ہے کہ قلم نے لکھا، آنکھوں نے پڑھا اور بات ختم ہوگئی۔ اس میں تو عمل دخل جذبہ کے خلوص، دل کے سوز اور ذہن کے رجحان کے بھی ہوتے ہیں۔ انسان کا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہر شے میں جو حسن و قبح موجود پاتے ہیں، وہ شے کے وصف ہونے کے باوجود اس کے جذب و قبول کا انحصار اس نظر پر بھی ہوتا ہے جو اس پر پڑتی ہے۔ یہ بھی غیر معمولی بات نہیں ہے کہ ہمیں ایک وقت میں ایک شے ایک کو بھلی معلوم ہو تو دوسرے اسے اسی طرح قبول نہ کریں۔ سب کی نظر میں وہی شے ہر لحہ ہر ایک کی نظر میں بھلی ہوگی جس میں دائمی اور ہمہ گیر صفات حسن موجود ہوں۔ عام شاعری ہو یا نعت گوئی ان کی بھی یہی صورت ہے۔ دائمی قدر اور ہمہ گیر صفت کے بغیر کوئی شعر یا فن پارہ زندہ نہیں رہتا اور جو صنف شاعری یعنی نعت میں ان صفات کو بغیر ذہنی کاوش کے برت سکے وہ نعت گو اور جو اسے سرسری نظر میں بھی پہچان سکے وہ نعت شناس ہوتا ہے۔ جذب و قبولیت کا سارا انحصار رجحان طبع، فطری ذوق اور مسلسل ذہنی مشق پر ہے۔ اس سے ایک مزاج بن جاتا ہے۔ یہی مزاج فرد کی شناخت قرار پاتا ہے۔ ان باتوں کے تناظر میں ابوالخیر کشفی کے جاننے والے ماسوا اس حقیقت کے کہ وہ ان کو پروفیسر مانتے ہیں، صاحب علم مانتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اصول پرست بھی ہیں اور انصاف پسند بھی۔ اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اُنھوں نے زندگی کی خاص روش کو اپنایا ہے وہ نام ونمو اور نمایش پسندی سے انحراف کرتے ہیں۔ اس پر
وارفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ حبِ رسول ﷺ کی دولت لازوال سے مالامال ہیں۔ ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کی ایسی صورت گری کی ہے کہ انھیں ہمہ صفت موصوف کہا جاسکتا ہے۔ میں نے انھیں شخصی

پروفیسر شفقت رضوی

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی نعت شناسی

نعت گوئی اور نعت شناسی عام ذہنی سطح سے بلندتر اوصاف ہیں کہ جن کے احوال کے انکشاف کے لیے الفاظ اپنی تنگ دامانی کا گلہ کرتے ہیں۔ نعت لفظوں کا کھیل نہیں جو آج کل عام طور پر جاری ہے کہ قلم نے لکھا، آنکھوں نے پڑھا اور بات ختم ہوگئی۔ اس میں تو عمل دخل جذبہ کے خلوص، دل کے سوز اور ذہن کے رجحان کے بھی ہوتے ہیں۔ انسان کا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہم شے میں جو حسن و قبح موجود پاتے ہیں، وہ شے کے وصف ہونے کے باوجود اس کے جذب و قبول کا انحصار اس نظر پر بھی ہوتا ہے جو اس پر پڑتی ہے۔ یہ بھی غیرمعمولی بات نہیں ہے کہ ہمیں ایک وقت میں ایک شے ایک کو بھلی معلوم ہو تو دوسرے اسے اسی طرح قبول نہ کریں۔ سب کی نظر میں وہی شے ہرلمحہ ہرایک کی نظر میں بھلی ہوگی جس میں دائمی اور ہمہ گیر صفات حسن موجود ہوں۔ عام شاعری ہو یا نعت گوئی ان کی بھی یہی صورت ہے۔ دائمی قدر اور ہمہ گیر صفت کے بغیر کوئی شعر یا فن پارہ زندہ نہیں رہتا اور جو صنف شاعری یعنی نعت میں ان صفات کو بغیر ذہنی کاوش کے برت سکے وہ نعت گو اور جو اسے سرسری نظر میں بھی پہچان سکے وہ نعت شناس ہوتا ہے۔ جذب و قبولیت کا سارا انحصار رجحان طبع، فطری ذوق اور مسلسل ذہنی مشق پر ہے۔ اس سے ایک مزاج بن جاتا ہے۔ یہی مزاج فرد کی شناخت قرار پاتا ہے۔ ان باتوں کے تناظر میں ابوالخیر کشفی کے جاننے والے ماسوا اس حقیقت کے کہ وہ ان کو پروفیسر مانتے ہیں، صاحب علم مانتے ہیں، تسلیم کرتے ہیں کہ وہ اصول پرست بھی ہیں اور انصاف پسند بھی۔ اس سے انکار نہیں کرسکتے کہ اُنھوں نے زندگی کی خاص روش کو اپنایا ہے وہ نام ونمو اور نمایش پسندی سے انحراف کرتے ہیں۔ اس پر
وارفتہ ہونے کے ساتھ ساتھ حبِ رسول ﷺ کی دولت لازوال سے مالامال ہیں۔ ان سب نے مل کر ان کی شخصیت کی ایسی صورت گری کی ہے کہ انھیں ہمہ صفت موصوف کہا جاسکتا ہے۔ میں نے انھیں شخصی قرب سے نہیں پہچانا، انھیں ان کی تحریروں سے پہچانا ہے۔ شخصی قرب میں ہر دو جانب سے احتیاط اور تکلف کے پردے حائل کیے جاتے ہیں۔ تحریریں (جو بکثرت ہوں اور یکساں کیفیت رکھتی ہوں) جھوٹ نہیں بولتیں۔ حضرت جوش ملیح آبادی اپنے خطوط کے آئینے میں عریاں نظر آتے اور اپنے احباب خاص کو عریاں کرتے ہیں تو قاری کے ذہن میں ایسی شکلیں محفوظ ہوجاتی ہیں جن کو ناپسند کرنے کے باوجود مٹایا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح ہر تحریر مفہوم و معانی بھی نہیں رکھتی بین سطور میں لکھنے والے کی ذات کو روشناس کرتی جاتی ہے۔ اس سے چاہے قاری کے ذہن میں مکمل تصویر نہ بنے، لکھنے والے کے بارے میں ایک خاکہ ضرور تشکیل پاجاتا ہے۔ ہم غالب کی فکر تو ان کے کلام کے ذریعے پہچانتے ہیں جب کہ ان کی ذات کو پہچاننے کا ذریعہ ان کے خطوط ہیں۔ شخص کا عکس نثر میں پورے خدوخال کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔ شاعری میں شاعر کے ذہن اور دل کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔

میں نے کشفی صاحب سے تعارف ان کی تحریروں کے ذریعے حاصل کیا ہے۔ اگر میں نے کہا ہے کہ وہ صاحبِ علم ہیں تو اس لیے نہیں کہ وہ پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری رکھتے ہیں، اس لیے نہیں کہ اُنھوں نے ایک جامعہ میں برسہابرس تدریس کا فرض ادا کرکے نیک نامی سمیٹی ہے بلکہ میں نے ان کے علم کا اندازہ ان کی تحریروں سے کیا ہے۔ پروفیسر حضرات تنخواہ اور مراعات کے لیے پڑھاتے ہیں۔ وہ ''پیشہ ور معلم'' نہیں۔ ان کی تدریس کا سلسلہ جامعہ کی کلاس روم تک محدود نہیں ۔ وہ تحریری دنیا میں معروف بھی ہیں اور درجہ استاد بھی رکھتے ہیں، جو جس موضوع پر لکھتے ہیں اس کے تمام پہلوؤں پر نظر رہتی ہے۔ وہ ہر پہلو اور ہر نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ میرے ۳۸ سالہ تدریسی تجربے نے مجھے یہ سکھایا ہے کہ موضوع کی وضاحت ہی تدریس کا فرض نہیں بلکہ طالب علم کے ذہن میں پیدا ہونے والا ممکنہ سوالات کے جوابات بھی وضاحت میں شامل ہونا چاہیے۔ اگر ایک جامع بحث کے باوجود طالب علم سوال کرنے پر مجبور ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ استاد نے بحث کے کسی پہلو کو تشنہ چھوڑا ہے۔ یہ استاد کی خامی ہے۔ کشفی صاحب تدریس کے اس گر سے واقف ہیں۔ جب وہ کوئی مقالہ سپردِ قلم کرتے ہیں ہم جیسے طالبانِ علم کے ذہن کے لیے سوال کرنے کا موقع نہیں چھوڑتے۔ وہ تحریر کے ذریعے تدریس کا فرض ادا کرتے ہیں اور خوب ادا کرتے ہیں۔ اس کی مثال میں ان کے مضمون ''نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم'' (''نعت رنگ''، شمارہ۴) کا حوالہ دوں گا۔ اس میں اُنھوں نے ''لفظ'' اس کی ظاہری، لغوی اور معنوی کیفیات کو نہایت بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔ مضمون عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ گنجینۂ علم اور محرکِ فکر ہے۔ امر واقعہ یہ ہے

کہ موضوعِ زیرِ بحث ایک کتاب کا متقاضی ہے جسے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ تحریر کر کے کشفی صاحب نے علم اور اسلوب پر اپنی کامل گرفت کا نمونہ بنادیا ہے۔ اب دیگر پروفیسر حضرات کے قلم سے ایسی تحریریں وجود میں آنے کا کہاں رواج ہے!

کشفی صاحب کی تحریروں سے واضح ہے کہ ان کا غالب رجحان مذہب کی طرف ہے اور مذہب ہی نے ان کی شخصیت پر حب اللہ اور حب رسول کا نور بکھیر دیا ہے۔ ان کے عقائد اور ان کی محبتیں ظاہری اور دکھاوے کی نہیں ہیں اسی لیے وہ بار بار حج کی سعادت حاصل کرتے اور بار بار عمرہ کی خاطر سفری صعوبتوں کو راحتِ جاں بنا کر قصد ارض پاک کرتے ہیں۔ ان کا ایک رشتہ علم و ادب سے ہے، دوسرا رشتہ مذہب، حب اللہ اور حبِ رسول ﷺ سے ہے۔ ان رشتوں نے یکجا ہو کر اظہار کی جو صورت اختیار کی ہے وہ ''وطن سے وطن تک'' اور ''نسبت'' سے ظاہر ہے۔ ان دونوں تصانیف میں جذبات کے خلوص اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بظاہر ان کے علمی مقالات سے مختلف ہیں ان سب کی تحریک ان کی خلوص کے جذبے سے ہوتی ہے۔

''وطن سے وطن تک'' پڑھیے تو معلوم ہو کہ لفظ کیونکر بولتے ہیں۔ بلکہ بولتے ہی نہیں، جاں گزیں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کو سفرنامہ کی صنف میں شامل کیا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں سفرنامے ملیں گے۔ ان سب میں مشاہدات کے ڈھیر ہیں، انھیں پڑھیے اور پیش کردہ معلومات سے ذہن کو انسائیکلوپیڈیا بنالیجیے۔ یہ خیر اور خبر کا ایک پہلو ہے۔ لیکن مشاہدہ اور حصولِ علم سے ماورا بھی ماورا ایک بات کی ہے۔ وہ ہے دل کی! دیکھنا ایک عمل ہے، محسوس کرنا دوسرا۔ ایک عام ہے دوسرا خواص کے حصے میں آیا ہے۔ روداد دیدار حرمین شریفین سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ روداد احساسات حرمین شریفین کے دو ایک نمونے ملیں گے ان میں ''وطن سے وطن تک'' کو شامل کیے بغیر گزارہ نہیں۔ ساری دنیا کی عکاسی تو کیمرے بھی کرتے ہیں وہ چاہے **Still** ہوں یا **Movie** دل کی دنیا کی ترجمانی صرف الفاظ کرتے ہیں وہ بھی جب کہ اہل قلم کو دل اور لفظ کو ساتھ لے کر چلنے کا سلیقہ آتا ہو۔

کشفی صاحب کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں مگر ''پیشہ ور شاعر'' نہیں۔ شاعری پیشہ ور شاعر کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہتا ہے۔ سوائے شاعر ہونے کے۔ شاعری کرنا کوئی بری بات نہیں لیکن لوگوں کے عمل نے اسے برائی کے شعبہ سے مربوط کردیا ہے۔ میری نظر میں شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسروں کے لیے شعر کہتے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں سے بڑھ گئی

کہ موضوع زیرِ بحث ایک کتاب کا متقاضی ہے جسے اختصار لیکن جامعیت کے ساتھ تحریر کر کے کشفی صاحب نے علم اور اسلوب پر اپنی کامل گرفت کا نمونہ بنادیا ہے۔ اب دیگر پروفیسر حضرات کے قلم سے ایسی تحریریں وجود میں آنے کا کہاں رواج ہے!

کشفی صاحب کی تحریروں سے واضح ہے کہ ان کا غالب رجحان مذہب کی طرف ہے اور مذہب ہی نے ان کی شخصیت پر حب اللہ اور حب رسول کا نور بکھیر دیا ہے۔ ان کے عقائد اور ان کی محبتیں ظاہری اور دکھاوے کی نہیں ہیں اسی لیے وہ بار بار حج کی سعادت حاصل کرتے اور بار بار عمرہ کی خاطر سفری صعوبتوں کو راحتِ جاں بنا کر قصد ارض پاک کرتے ہیں۔ ان کا ایک رشتہ علم و ادب سے ہے، دوسرا رشتہ مذہب، حب اللہ اور حبِ رسول ﷺ سے ہے۔ ان رشتوں نے یکجا ہو کر اظہار کی جو صورت اختیار کی ہے وہ ''وطن سے وطن تک'' اور ''نسبت'' سے ظاہر ہے۔ ان دونوں تصانیف میں جذبات کے خلوص اور گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ بظاہر ان کے علمی مقالات سے مختلف ہیں ان سب کی تحریک ان کی خلوص کے جذبے سے ہوتی ہے۔

''وطن سے وطن تک'' پڑھیے تو معلوم ہو کہ لفظ کیونکر بولتے ہیں۔ بلکہ بولتے ہی نہیں، جاں گزیں ہوتے ہیں۔ اس کتاب کو سفرنامہ کی صنف میں شامل کیا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ہزاروں کی تعداد میں سفرنامے ملیں گے۔ ان سب میں مشاہدات کے ڈھیر ہیں، انھیں پڑھیے اور پیش کردہ معلومات سے ذہن کو انسائیکلوپیڈیا بنالیجیے۔ یہ خیر اور خبر کا ایک پہلو ہے۔ لیکن مشاہدہ اور حصولِ علم سے ماورا بھی ماورا ایک بات کی ہے۔ وہ ہے دل کی! دیکھنا ایک عمل ہے، محسوس کرنا دوسرا۔ ایک عام ہے دوسرا خواص کے حصے میں آیا ہے۔ روداد دیدار حرمین شریفین سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ روداد احساسات حرمین شریفین کے دو ایک نمونے ملیں گے ان میں ''وطن سے وطن تک'' کو شامل کیے بغیر گزارہ نہیں۔ ساری دنیا کی عکاسی تو کیمرے بھی کرتے ہیں وہ چاہے Still ہوں یا Movie دل کی دنیا کی ترجمانی صرف الفاظ کرتے ہیں وہ بھی جب کہ اہل قلم کو دل اور لفظ کو ساتھ لے کر چلنے کا سلیقہ آتا ہو۔

کشفی صاحب کے بارے میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں مگر ''پیشہ ور شاعر'' نہیں۔ شاعری پیشہ ور شاعر کا اوڑھنا بچھونا ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہتا ہے۔ سوائے شاعر ہونے کے۔ شاعری کرنا کوئی بری بات نہیں لیکن لوگوں کے عمل نے اسے برائی کے شعبہ سے مربوط کردیا ہے۔ میری نظر میں شاعر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسروں کے لیے شعر کہتے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں سے بڑھ گئی ہے۔ دوسری قسم کے شاعر وہ ہیں جو صرف اپنے لیے شاعری کرتے ہیں۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ خاص لمحات میں ایسی وجدانی کیفیت ان پر مسلط ہوجاتی ہے جو انھیں شعر کہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد خوردبینی اقلیت میں ہوتی ہے حقیقی شاعر یہی ہوتے ہیں۔ ان کا کلام خود کلامی کی ذیل میں آتا ہے۔ کشفی صاحب اس اقلیتی گروہ میں شامل ہونے کے مستحق اپنے نعتیہ مجموعہ کلام ''نسبت'' سے قرار پاتے ہیں۔

کشفی صاحب نے اپنے دل کی نسبت ذات رسول پاک ﷺ سے تلاش کرنے کی خاطر اس میں شامل نعتیں کہیں ہیں۔ ''نسبت'' بازار میں فروخت کرنے اور نیک نامی سمیٹنے کے لیے تخلیق نہیں کی گئی۔ یہ ذات کی ممدوح سے ''نسبت'' کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ کشفی صاحب کا ذہن اور دل جس دنیا سے نسبت رکھتا ہے اس میں رہتے ہوئے لمحات وجد میں کہے گئے اشعار اس کتاب کی زینت ہیں۔ یہ بھی میرے علم میں ہے کہ ان کی نعتوں کی کتابی صورت گری ان کی خواہش اور آرزو کی رہین منت نہیں۔ ان کے قدرشناسوں کی قدردانی کی تکمیل کی صورت ہے۔ نعتوں کی اشاعت سے عرصہ تک بے پروا رہنا دلیل اس بات کی ہے کہ ان کی شاعری دوسروں کے لیے نہیں ان کے اپنے لیے ہوتی ہے اور جو بات انسان اپنے آپ سے کہتا ہے وہ سچ ہی ہوتی ہے۔

یہاں میں ان نکات پر اصرار کروں گا کہ نعت گوئی کا فرض وہی ادا کرسکتے ہیں جو رموز شاعری سے واقف ہوں۔ فنِ نعت گوئی سے شناسائی رکھتے ہوں اور حضور ﷺ کی ذاتِ پاک سے نسبت رکھتے ہوں۔ جہاں یہ باتیں نہ ہوں وہاں نعت گوئی نہیں ہوتی، صرف شاعری ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں نعت کہنے والوں کی کمی نہیں لیکن کتنے ہیں جو رسول شناسی کی منزل سے قریب تر ہوکر، شاعری کے رموز شناس ہوتے ہوئے نعت شناسی کا حق ادا کرنے کے قابل ہوں گے جو ایسے نہ ہوں انھیں نعت گوئی کا بھی حق نہیں۔ جس شاعرانہ کیفیت میں شعر وارد ہوتے ہیں اس کے بارے میں کشفی صاحب کا کہنا ہے۔

> علم جب وجدان کی مدد سے جذبہ بن جائے اور دل کی دھڑکن بن جائے تو دوسروں کے راستے روشن ہوجاتے ہیں۔ عقل تجزیہ کے عمل سے درجہ بدرجہ جب نتیجے تک پہنچتے ہیں وجدان کسی لمحہ مقررہ میں اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ آپ چاہیں تو اسے اقبال کے الفاظ میں ''دانش

نورانی'' کہہ لیں۔

(''نعت رنگ'': شمارہ۔۱۰،ص ۲۲۵)

اُنھوں نے یہ بات کسی حوالے سے بھی لکھی ہو، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ اظہار علم کی بنیاد پر ہی نہیں، تجربے کی بنیاد پر بھی ہے۔ ان الفاظ سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ نعت گوئی اور نعت شناسی کے جو لوازمات ہیں وہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ وہ نعت کہہ رہے ہوں اور نعت گوئی کو موضوع بحث بنا رہے ہوں۔ زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے، شعری رموز سے واقف ہونے اور حبِ رسول ﷺ سے سرشار ہونے کی بنا پر کشفی صاحب کو حق پہنچتا ہے کہ وہ نعت گوئی فرمائیں، نعت شناسی پر اظہار خیال کریں اور ان جذبات کو جو وجدان کی کیفیت میں گزرتے ہیں، لفظوں میں قید کرلیں چاہے اس کے نتیجے میں شعر کی تخلیق ہو یا نثر پارہ وجود میں آئے۔ ان کی شعری نعت گوئی کا نمونہ ''نسبت'' ہے اور نثری نعت گوئی کے نمونے ''وطن سے وطن تک'' میں ملتے ہیں لیکن نعت شناسی کے حوالے سے ان کے توضیحی اور تنقیدی خیالات سے ان کے مضامین آراستہ ہیں جو بیش تر ''نعت رنگ'' میں اور کم تر دیگر رسائل میں جگہ پاکر غور وفکر اور تنقید وتبصرے کے موضوع بن چکے ہیں۔

جب میں کشفی صاحب کی علمی، ادبی اور نعت شناسی کے حوالوں سے ان کا تعارف توصیفی انداز میں کرتا ہوں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے خیالات سے سوفیصد متفق ہوں، اسی طرح دیگر اہل علم نے بھی بعض نکات پر ان سے اختلاف کیا ہے۔ اختلاف اور تردید یا تنسیخ قطعی جداگانہ چیزیں ہیں۔ انسانی سوچ کے پیمانے اور زاویے مختلف ہوتے ہیں۔ چوں کہ سب کے طبائع یکساں نہیں اس لیے اختلاف کی گنجایش رہتی ہے۔ اس کا مقصد نکات کو تسلیم کرنے میں مانع اسباب و دلائل ہوتے ہیں۔ اس نوع کے مباحث سے آخری اور قطعی رائے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے باحوصلہ اور صاحب ظرف وہ ہوتا ہے جو اپنے خیالات سے اختلاف پر رنجیدہ نہیں ہوتا۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور کھلے ذہن سے انھیں سن کر اپنی اور دوسرے کی رائے کا موازنہ اور تقابل کرکے کسی رائے پر قطعی رائے پر پہنچتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کشفی صاحب میں تحمل اور باردیگر غور وفکر کا حوصلہ موجود ہے۔ وہ ان سے اختلاف کرنے والوں کے مخالف نہیں بلکہ اپنا دوست مانتے ہیں۔

زیادہ تر ان کے خیالات سے اتفاق اور کبھی کبھی اختلاف بھی پایا گیا ہے۔ میں نے فی الوقت ان کی اُن تحریروں پر اظہارِ خیال نہیں کروں گا جو اُنھوں نے نعتوں کے مجموعے پر بطور تعارف تبصرہ یا تقریظ کے لکھے

نورانی'' کہہ لیں۔

(''نعت رنگ'': شمارہ۔۱۰،ص ۲۲۵)

اُنھوں نے یہ بات کسی حوالے سے بھی لکھی ہو، ظاہر یہی ہوتا ہے کہ یہ اظہارعلم کی بنیاد پر ہی نہیں، تجربے کی بنیاد پر بھی ہے۔ ان الفاظ سے ہمارے بیان کی تائید ہوتی ہے کہ نعت گوئی اور نعت شناسی کے جو لوازمات ہیں وہ ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتے ہیں۔ وہ نعت کہہ رہے ہوں اور نعت گوئی کو موضوع بحث بنارہے ہوں۔ زبان کی نزاکتوں کو سمجھنے، شعری رموز سے واقف ہونے اور حبِ رسول ﷺ سے سرشار ہونے کی بنا پر کشفی صاحب کو حق پہنچتا ہے کہ وہ نعت گوئی فرمائیں، نعت شناسی پر اظہار خیال کریں اور ان جذبات کو جو وجدان کی کیفیت میں گزرتے ہیں، لفظوں میں قید کرلیں چاہے اس کے نتیجے میں شعر کی تخلیق ہو یا نثر پارہ وجود میں آئے۔ ان کی شعری نعت گوئی کا نمونہ ''نسبت'' ہے اور نثری نعت گوئی کے نمونے ''وطن سے وطن تک'' میں ملتے ہیں لیکن نعت شناسی کے حوالے سے ان کے توضیحی اور تنقیدی خیالات سے ان کے مضامین آراستہ ہیں جو بیش تر ''نعت رنگ'' میں اور کم تر دیگر رسائل میں جگہ پاکر غور وفکر اور تنقید وتبصرے کے موضوع بن چکے ہیں۔

جب میں کشفی صاحب کی علمی، ادبی اور نعت شناسی کے حوالوں سے ان کا تعارف توصیفی انداز میں کرتا ہوں تو اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں ان کے خیالات سے سوفیصد متفق ہوں، اسی طرح دیگر اہل علم نے بھی بعض نکات پر ان سے اختلاف کیا ہے۔ اختلاف اور تردید یا تنسیخ قطعی جداگانہ چیزیں ہیں۔ انسانی سوچ کے پیمانے اور زاویے مختلف ہوتے ہیں۔ چوں کہ سب کے طبائع یکساں نہیں اس لیے اختلاف کی گنجایش رہتی ہے۔ اس کا مقصد نکات کو تسلیم کرنے میں مانع اسباب و دلائل ہوتے ہیں۔ اس نوع کے مباحث سے آخری اور قطعی رائے تک پہنچنے میں مدد ملتی ہے باحوصلہ اور صاحب ظرف وہ ہوتا ہے جو اپنے خیالات سے اختلاف پر رنجیدہ نہیں ہوتا۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرتا ہے اور کھلے ذہن سے انھیں سن کر اپنی اور دوسرے کی رائے کا موازنہ اور تقابل کرکے کسی رائے پر قطعی رائے پر پہنچتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ کشفی صاحب میں تحمل اور باردیگر غور وفکر کا حوصلہ موجود ہے۔ وہ ان سے اختلاف کرنے والوں کے مخالف نہیں بلکہ اپنا دوست مانتے ہیں۔

زیادہ تر ان کے خیالات سے اتفاق اور کبھی کبھی اختلاف بھی پایا گیا ہے۔ میں نے فی الوقت ان کی اُن تحریروں پر اظہارِ خیال نہیں کروں گا جو اُنھوں نے نعتوں کے مجموعے پر بطور تعارف تبصرہ یا تقریظ کے لکھے ہیں ان کو میں فرمائشی تحریروں کا نام دیتا ہوں۔ ان میں بھی کام کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کم کم۔

نعت شناسی اور شعر شناسی جداگانہ باتیں نہیں ہیں۔ ہمارے ادب میں مذہبی لٹریچر پر تنقید کا رواج نہیں۔ مذہبی بلکہ نیم مذہبی لٹریچر کو بھی تقدیس کے لباس میں لپیٹ کر احترام کے طاق میں سجادینے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ جب نعت میں شعری آہنگ ہوتا ہے تو اس کو اعلیٰ درجے کی شاعری کے لیے قبول کیے ہوئے تلازموں کے مطابق ہونا چاہیے اور اس پر تنقیدی نظر ڈالی جائے تو مقصد انھیں تلازموں، معیار اور سطح کی بازیافت ہوتا ہے۔ نعت کو کسی عذر جائز یا ناجائز کی بنا پر نہ تو ادب سے خارج کیا جاسکتا ہے اور نہ اس کو تنقید وتبصرے کے لائق ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے صورتِ حال کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

> بدقسمتی یہ ہے کہ نعتیہ شاعری یا ایسی شاعری کی جس کے موضوع یا متن اسلام یا اسلامی قدار اور روایات سے ہو کچھ زیادہ لائق پزیرائی خیال نہیں کیا جاتا، اول ان اقدار پر مشتمل نظموں کو مذہب، اخلاقیات اور تاریخ کا منظوم درسِ خیال کرکے ہمارے ناقدین ان پر نظر ڈالنا ہی پسند نہیں کرتے اور اگر بے دلی و تنگ نظری کے ساتھ کسی نے اس پر توجہ کی تو ایسی نظموں کو صحافت سے قریب تر موضوعاتی شاعری کا نام دے کر انھیں بے وقعت اور کم مایہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے ناقدین کے نزدیک موضوعاتی شاعری بحیثیت مجموعی خارجی واقعات اور غیر موضوعاتی شاعری داخلی کوائف سے تعلق رکھتی ہے۔

(ڈاکٹر فرمان فتح پوری: اُردو کی نعتیہ شاعری، لاہور، ۱۹۷۴ء، ص ۳۲)

حالاں کہ ڈاکٹر فرمان نے حقیقت حال کی کامل ترجمانی نہیں کی ہے۔ ان نقادوں کے ناموں کے اظہار سے گریز کیا ہے جو موضوعاتی اور غیر موضوعاتی شاعری کی تفریق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے اس مبہم بیان کے بعد اس کی تائید یا تردید سے گریز فرماکر قارئین کو الجھن کی حالت میں چھوڑ دیا ہے۔ حالاں کہ ماسوا غزل کوئی صنف شاعری غیر موضوعاتی ہوتی ہی نہیں۔ نظم کا موضوع ہوتا ہے، قصیدہ کا موضوع ہوتا ہے، مثنوی اور منظوم داستان کا موضوع ہوتا ہے اور ان سب پر تنقید وتبصرہ کا رواج ہے۔

بہرحال اس بیان سے ایک رجحان کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر ''موضوع یا متن اسلام یا اسلامی اِقدار

اور روایات سے ہو تو کچھ زیادہ لائق پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا۔'' لیکن اب یہ ادبی روایت بھی ٹوٹ چکی ہے اور اس روایت شکنی کا سہرا جن اہلِ علم کے سر ہے ان میں بلاشبہ کشفی صاحب کا نام نمایاں ہے اور موضوع کے مضمرات کے ساتھ اختلافی آرا کو صحت مندانہ رجحان کے باعث لائق اشاعت قرار دینے کا جرأت مندانہ کام ''نعت رنگ'' نے انجام دیا۔ اب موضوعاتی اور غیرموضوعاتی شاعری کے خود ساختہ نظریاتی بت پاش پاش ہو چکے ہیں اور کھل کر اظہارِ خیال کے نئے سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ اس مقصد میں یہ حوالہ غیرضروری نہ ہوگا کہ کشفی صاحب کے عالمانہ خیالات کی اشاعت کے ساتھ ان سے اختلاف کرنے والوں کے خیالات کو بھی نعت رنگ میں جگہ دے کر غور وفکر کے نئے نئے دریچے کھولنے کے سامان کیے جا رہے ہیں۔

نعت کا مطالعہ شعری تلازمے کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے۔ کشفی صاحب نے بھی اس بات پر زور دیا ہے وہ چاہے نعت گو یا نعت پر اظہار خیال کرنے والا ہو اس پر پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ فنِ شعر گوئی سے واقف ہوں۔ لیکن فنِ شعر گوئی سے قبل بھی ایک امر ضروری ہے وہ ہے درست زبان۔ عام آدمی اور شاعر دونوں اگر معمولی سی حس رکھتے ہوں تو لفظ لفظ کے استعمال میں فرق رکھیں گے۔ لفظ بے جان نہیں۔ جاندار اور توانا ہوتے ہیں ہر لفظ کے استعمال کا مناسب موقع ومحل ہوتا ہے، اس کے اصول وضوابط کسی کتاب میں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ وجدان ہوتا ہے جس کی کارفرمائی سے بے خبر رہتے ہوئے بھی عام آدمی لفظ کے صحیح استعمال پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک لفظ کے ہم معنی یا قریب تر معنی والے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں۔ وجدان ان کے استعمال کے موقع ومحل کا تعین کرتا ہے اور کثرتِ استعمال تک یہ تعین حرفِ آخر قرار پاتا ہے۔ یہی صورت ''روزمرہ'' اور ''محاورہ'' کی ہوتی ہے۔ (''نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم''، ''نعت رنگ'': شمارہ۴) میں اس نوع کے مباحث کو پیش کیا گیا ہے۔ میں اس مضمون کی مشمولات اور ان کی توضیحات میں نہیں جاؤں گا لیکن چند نکات کا اعادہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کا آغاز اس نظریہ سے کرنا مناسب ہوگا کہ ''ادب لفظوں کا فن'' ہے (ص۲۷) اور پھر ان لفظوں کی ادائی ہے لہجہ معنی بدل دیتا ہے (ص۲۴،۲۵) لفظ صرف آواز نہیں اس کا رشتہ معانی سے ہوتا ہے (ص۲۱) لفظ کے معنے بھی ہوتے ہیں اور لفظ کے مضمرات Shade of Meaning بھی ہوتے ہیں (ص۲۱) لفظ کی مترادفات ہوتی ہیں لیکن کسی جملہ یا شعر میں ایک لفظ کو ہٹا کر اس کے ہم معنی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا (ص۲۲،۲۳) اور پھر لفظ کی جس میں یہ تمام نکات زبان دانی کی بنیاد ہیں ان کو جانے بغیر نہ تو روزمرہ زندگی میں ان کا استعمال

اور روایات سے ہو تو کچھ زیادہ لائق پذیرائی خیال نہیں کیا جاتا۔" لیکن اب یہ ادبی روایت بھی ٹوٹ چکی ہے اور اس روایت شکنی کا سہرا جن اہلِ علم کے سر ہے ان میں بلاشبہ کشفی صاحب کا نام نمایاں ہے اور موضوع کے مضمرات کے ساتھ اختلافی آرا کو صحت مندانہ رجحان کے باعث لائق اشاعت قرار دینے کا جرأت مندانہ کام "نعت رنگ" نے انجام دیا۔ اب موضوعاتی اور غیرموضوعاتی شاعری کے خود ساختہ نظریاتی بت پاش پاش ہوچکے ہیں اور کھل کر اظہارِ خیال کے نئے سامان مہیا ہورہے ہیں۔ اس مقصد میں یہ حوالہ غیرضروری نہ ہوگا کہ کشفی صاحب کے عالمانہ خیالات کی اشاعت کے ساتھ ان سے اختلاف کرنے والوں کے خیالات کو بھی نعت رنگ میں جگہ دے کر غور وفکر کے نئے نئے دریچے کھولنے کے سامان کیے جارہے ہیں۔

نعت کا مطالعہ شعری تلازمے کو مدنظر رکھ کر ہونا چاہیے۔ کشفی صاحب نے بھی اس بات پر زور دیا ہے وہ چاہے نعت گو یا نعت پر اظہار خیال کرنے والا ہو اس پر پہلا فرض یہ عائد ہوتا ہے کہ وہ فنِ شعر گوئی سے واقف ہوں۔ لیکن فنِ شعر گوئی سے قبل بھی ایک امر ضروری ہے وہ ہے درست زبان۔ عام آدمی اور شاعر دونوں اگر معمولی سی حس رکھتے ہوں تو لفظ لفظ کے استعمال میں فرق رکھیں گے۔ لفظ بے جان نہیں۔ جاندار اور توانا ہوتے ہیں ہر لفظ کے استعمال کا مناسب موقع ومحل ہوتا ہے، اس کے اصول وضوابط کسی کتاب میں لکھے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ وجدان ہوتا ہے جس کی کارفرمائی سے بےخبر رہتے ہوئے بھی عام آدمی لفظ کے صحیح استعمال پر مجبور ہوتا ہے۔ ایک لفظ کے ہم معنی یا قریب تر معنی والے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں۔ وجدان ان کے استعمال کے موقع ومحل کا تعین کرتا ہے اور کثرتِ استعمال تک یہ تعین حرفِ آخر قرار پاتا ہے۔ یہی صورت "روزمرہ" اور "محاورہ" کی ہوتی ہے۔ ("نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم"، "نعت رنگ": شمارہ۴) میں اس نوع کے مباحث کو پیش کیا گیا ہے۔ میں اس مضمون کی مشمولات اور ان کی توضیحات میں نہیں جاؤں گا لیکن چند نکات کا اعادہ بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ اس کا آغاز اس نظریہ سے کرنا مناسب ہوگا کہ "ادب لفظوں کا فن" ہے (ص۲۷) اور پھر ان لفظوں کی ادائی ہے لہجہ معنی بدل دیتا ہے (ص۲۴،۲۵) لفظ صرف آواز نہیں اس کا رشتہ معانی سے ہوتا ہے (ص۲۱) لفظ کے معنے بھی ہوتے ہیں اور لفظ کے مضمرات **Shade of Meaning** بھی ہوتے ہیں (ص۲۱) لفظ کی مترادفات ہوتی ہیں لیکن کسی جملہ یا شعر میں ایک لفظ کو ہٹا کر اس کے ہم معنی لفظ استعمال نہیں کیا جاسکتا (ص۲۲،۲۳) اور پھر لفظ کی جس میں یہ تمام نکات زبان دانی کی بنیاد ہیں ان کو جانے بغیر نہ تو روزمرہ زندگی میں ان کا استعمال درست طریقے سے ہوسکتا ہے اور نہ شعر و ادب میں۔ ان مباحث کی تفہیم وہی اہلِ علم کرسکتا ہے جس کا ذہن ان سب پر حاوی ہو اور تمام تر غور وخوض کے بعد ان کے اُمور کو ذہن نشین کرچکا ہو۔ کشفی صاحب نے متذکرہ مضمون میں سارے نکات کو قابلِ فہم بنا کر پیش کیا ہے۔ لفظ کی روح کو پاجانے والے ہی اس کو برتنے کا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اس سلیقے سے شعر میں اثر پیدا ہوتا ہے۔ اسی کی بنا پر شعر کی تعریف کی جاتی ہے اور اس سے شاعر کی شناخت بنتی ہے۔ اسے عام لفظوں میں "کاری گری" کہیں جس کی اعلیٰ سطح مرصع سازی ہوتی ہے۔

شعر میں "تصویر سامانی" بھی کی جاتی ہے۔ اس میں موسیقی پیدا کی جاتی ہے۔ ان کو ملا کر مضمون اور مضمون میں تاثیر سموئی جاتی ہے۔ جب لازوال شعر کی تخلیق مکمل ہوتی ہے، کشفی صاحب نے زیرِبحث مضمون کے ایک حصے میں "لفظ اور نعت" کی ذیلی سرخی کے ساتھ نعت کی تخلیقی اُمنگ اور شعر کی ہمہ جہت صفت کی طرف اشارے کیے ہیں۔ ان کا ایک انوکھا دعویٰ ہے۔ اس کی تصدیق باکمال شاعر ہی کرسکتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

> تخلیقی عمل بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ ضروری نہیں کہ فن کار پر تخلیق کا مرحلہ پوری طرح روشن ہو۔ بڑی شاعری ایک چہارسمتی مخاطبہ اور مکالمہ ہے۔ آدمی کا مکالمہ اپنی ذات سے، آدمی کا مکالمہ اپنے رب سے۔ مسلمان شاعر کے سلسلے میں یوں کہنا چاہیے کہ اپنے رب اور اپنے رسول ﷺ سے۔

("نعت رنگ"، شمارہ۴، ص۳۷)

کشفی صاحب کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شعر کی تخلیق وجدان کی مرہونِ منّت ہے۔ اس کے تخلیقی عمل میں شعوری کوشش برائے نام ہوتی ہے اور وہ خود اس ہونے والے عمل سے آگاہ نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کشفی صاحب کا تجزیہ درست ہو لیکن ہمارے خیال میں شعور کے دخل کو یکسر نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب شاعر غزل کہتا ہے تو اس کا شعور مجاز کی رنگینی اور حسن کی رنگارنگی سے محصور ہوتا ہے۔ جب وہ محبت کا ذکر کرتا ہے تو دل پر گزری اس کو یاد رہتی ہے۔ جب وہ نعت کہتا ہے تو دانستہ یا نادانستہ طور پر لفظ، تراکیب، بندش، مضمون ہر ایک میں احترام کو ملحوظ رکھے بغیر مرصع کاری نہیں کرتا لیکن کشفی صاحب کی بات کو شاعر کے حوالے سے سمجھنے کے بجائے قاری یا سامع کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں صرف اور صرف

سچائی نظر آئے گی۔ یہ مسئلہ انفرادیت نفسیات کا ہے۔ فرائیڈ اور اس کے تابعین انسانی نفسیات کے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے انھیں مساوی طور پر تمام انسانوں پر قابلِ اطلاق قرار دیتے ہیں جو قطعی درست نہیں۔ ہر فرد کی افتادطبع، فطری رجحان، مزاج اس کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور سب کا ماحول یکساں نہیں ہوتا اس لیے سب کی اُفتادِطبع، فطری رجحان، مزاج، اندازِ فکر اور جذبہ قبولیت ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ الفریڈ ایڈلر کے مطابق ہر فرد کی نفسیات الگ ہوتی ہے اور موقع ومحل کے لحاظ سے مزاج او رموڈ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں ایک مزاجی کیفیت میں ایک شے پسند آتی ہے دوسری مزاجی کیفیت میں اس کے بارے میں رائے بدل جاتی ہے۔ یہی معاملہ شعر کا ہوتا ہے۔ کوئی شعر خاص موڈ میں پسند خاطر ہوتا ہے تو تبدیلی موڈ میں ساتھ اس کی پسندیدگی باقی نہیں رہتی۔ نفسیاتی طور پر اس کے امکانات سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ شاعر ایک شعر کہتا ہے اور اس کے مفہوم سے کماحقہ طور پر واقف ہی نہیں ہوتا، درست نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تخلیق عمل کی پیچیدگی میں ہر مرحلہ اس پر پوری طرح روشن نہ ہو لیکن تخلیقی عمل سے گزرنے کے بعد اپنے تخلیقی عمل کے حاصل پر وہ غور تو کرتا ہے اور اس میں لفظی ومعنوی ترمیم واصلاح بھی کرتا ہے ایسے لمحات میں معنوں اور اس کے پہلوؤں پر غور وفکر کا موقع تو مل جاتا ہے، حضرت احسان دانش کا ایک شعر تو کشفی صاحب نے نعت کا قرار دیا جب کہ شاعر نے اسے نعتیہ شعر کے طور پر کہنے سے انکار کردیا۔ اس مثال میں دونوں فریق کے نکات نظر درست معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر نے اپنی دانست میں:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

محبوب مجازی کے حوالے سے کہا کشفی صاحب نے اس کو حضور اکرم ﷺ کی ذات سے متعلق سمجھا۔ یہاں دونوں کے بیانات کو غیر معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس بحث میں کئی نکات پر غور کرنا ہوگا۔

۱۔ شاعر کا مجموعی شعری مزاج اور نظریہ کیا ہے؟

۲۔ شعر کے الفاظ سے کیا اشارہ ملتا ہے؟

۳۔ شاعر کا نکتہ نظر معلوم کیا جائے اور اسی کو درست سمجھا جائے۔

۴۔ قاری/ سامع اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ کسی شعر کے مفہوم کو مجازی سے متعلق کرے یا خدا اور رسول ﷺ سے! اس کے لیے شعر کے الفاظ اس کے ممد ہوں گے۔ الہام کی صورت میں اس کی

سچائی نظر آئے گی۔ یہ مسئلہ انفرادیت نفسیات کا ہے۔ فرائیڈ اور اس کے تابعین انسانی نفسیات کے اصولوں کا تعین کرتے ہوئے انھیں مساوی طور پر تمام انسانوں پر قابلِ اطلاق قرار دیتے ہیں جو قطعی درست نہیں۔ ہر فرد کی افتادِ طبع، فطری رجحان، مزاج اس کے ماحول میں پروان چڑھتے ہیں اور سب کا ماحول یکساں نہیں ہوتا اس لیے سب کی اُفتادِ طبع، فطری رجحان، مزاج، اندازِ فکر اور جذبہِ قبولیت ایک طرح کا نہیں ہوتا۔ الفریڈ ایڈلر کے مطابق ہر فرد کی نفسیات الگ ہوتی ہے اور موقع ومحل کے لحاظ سے مزاج او رموڈ میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ہمیں ایک مزاجی کیفیت میں ایک شے پسند آتی ہے دوسری مزاجی کیفیت میں اس کے بارے میں رائے بدل جاتی ہے۔ یہی معاملہ شعر کا ہوتا ہے۔ کوئی شعر خاص موڈ میں پسند خاطر ہوتا ہے تو تبدیلی موڈ میں ساتھ اس کی پسندیدگی باقی نہیں رہتی۔ نفسیاتی طور پر اس کے امکانات سے انکار ممکن نہیں لیکن ان کا یہ کہنا کہ شاعر ایک شعر کہتا ہے اور اس کے مفہوم سے کماحقہ طور پر واقف ہی نہیں ہوتا، درست نہیں۔ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ تخلیق عمل کی پیچیدگی میں ہر مرحلہ اس پر پوری طرح روشن نہ ہو لیکن تخلیقی عمل سے گزرنے کے بعد اپنے تخلیقی عمل کے حاصل پر وہ غور تو کرتا ہے اور اس میں لفظی ومعنوی ترمیم واصلاح بھی کرتا ہے ایسے لمحات میں معنوں اور اس کے پہلوؤں پر غور وفکر کا موقع تو مل جاتا ہے، حضرت احسان دانش کا ایک شعر تو کشفی صاحب نے نعت کا قرار دیا جب کہ شاعر نے اسے نعتیہ شعر کے طور پر کہنے سے انکار کردیا۔ اس مثال میں دونوں فریق کے نکات نظر درست معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر نے اپنی دانست میں:

ہوائیں ماری ماری پھر رہی ہیں
ترا نقشِ کفِ پا ڈھونڈنے کو

محبوب مجازی کے حوالے سے کہا کشفی صاحب نے اس کو حضور اکرم ﷺ کی ذات سے متعلق سمجھا۔ یہاں دونوں کے بیانات کو غیر معتبر قرار نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اس بحث میں کئی نکات پر غور کرنا ہوگا۔

۱۔ شاعر کا مجموعی شعری مزاج اور نظریہ کیا ہے؟
۲۔ شعر کے الفاظ سے کیا اشارہ ملتا ہے؟
۳۔ شاعر کا نکتہ نظر معلوم کیا جائے اور اسی کو درست سمجھا جائے۔
۴۔ قاری/ سامع اپنی رائے قائم کرنے میں آزاد ہوتا ہے۔ وہ کسی شعر کے مفہوم کو مجازی سے متعلق کرے یا خدا اور رسول ﷺ سے! اس کے لیے شعر کے الفاظ اس کے ممد ہوں گے۔ الہام کی صورت میں اس کی رائے غیر مستند نہیں ہوگی۔

اسی طرح بطور مثال کشفی صاحب نے اور شعر نقل کیے ہیں:

خوب پردہ ہے کہ چلمن سے لگے بیٹھے ہیں
صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں

کیا ہے سیرگہ زندگی میں رخ جس سمت
ترے خیال سے ٹکرا کے رہ گیا ہوں میں

زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

آخری شعر غالب کی تجمل حسین خان کے لیے مدحیہ غزل کا ہے۔ غالب کے اعلان کے باوجود اس کو ان کے بارے میں نہ سمجھنا زیادتی ہے۔ محولہ بالا اشعار نمبر۱ اور ۲ کے معاملے میں ابہام ضرور ہے پہلے شعر کا مفہوم ہی نہیں مزاج بھی مجاز کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دوسرا شعر ''دو رخا'' ہے۔ کشفی صاحب نے ان اشعار کے بارے میں بحث کا حاصل یہ قرار دیا ہے کہ:

> جب کوئی شعر اپنے مصداق، ممدوح یا موضوع سے بڑا ہوجاتا ہے تو وہ نعت کا شعر بن جاتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ محمد عربی ﷺ، معراجِ انسانیت ہیں۔ عظمت آدم کا آخری نشان۔

(''نعت رنگ'' شمارہ۴، ص۳۹)

اس بارے میں جرأت اظہار سے کام لوں تو عرض کروں یہ شاعری کے بارے میں نظریہ نہیں البتہ کشفی صاحب کا زاویہ نظر ہے۔ وہ اسی طور پیش کرتے تو مناسب ہوتا۔

اُنھوں نے نظریہ کے طور پر پیش کر کے خواہ مخواہ بحث کے دروازے کھول دیے ہیں۔ دوسری بات کا اظہار بھی ضروری ہے کہ کشفی صاحب سے معذرت کے ساتھ عرض کہ شعر میں مجاز کا رنگ غالب دیکھنے کا ایک دور ہوتا ہے جو اب گزر چکا۔ اسے اُفتادِ طبع کہیے یا ان کی عمر کا تقاضا کہ خدا اور رسول ﷺ ان کے قلب اور روح پر اس طرح چھائے ہوئے ہیں کہ یہ باطن تصوف کی کتنی ہی منزلیں طے کر چکے ہوں گے۔ ان کی روح ترقی کی کن درجات سے بلند تر ہوچکی ہے۔ اس کا اندازہ ان کو بھی نہ ہوگا آثار یہ کہہ رہے ہیں کہ ان کے شعر پر ہمہ اوست اور ہمہ محمد ﷺ کا غلبہ ہے۔ یہ معاملات خوب ہیں دعا ہے اس میں اور ترقی ہو۔

اسے ذات تک رکھیں۔ انسانی فکر کی پہنچ یا نظریہ خیال نہ کریں۔ یہی بحث ہے جو آگے بڑھی تو ایک اور مقالہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ''نعت رنگ'' شمارہ:۹ میں ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' کے عنوان سے اس میں اعادہ کیا گیا کہ

جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد اور نعت کی دنیامیں پہنچ جاتا ہے۔ (ص۱۴)

یہ ہمارا فرض نہیں اور نہ یہ وتیرہ ہونا چاہیے کہ ہم شاعر کو ایک دنیا سے اُٹھا کر دوسری دنیا میں پہنچادیں بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ شعر کی بلندی اور لامحدودیت نے شاعر کی فکری رسائی کو حمد و نعت کی دنیا جیسی بنادیا ہے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے غزلوں کے بے شمار اشعار درج کیے ہیں جن کا حوالہ مجاز کی بجائے ذات حسن اور ذاتِ رسول ﷺ بنتے ہیں۔ محبّ مکرم احمد صغیر صدیقی نے اس مضمون پر اعتراضات کرتے ہوئے۔(''نعت رنگ'' شمارہ:۱۱) میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بھی اس نکتہ کو نہیں پاسکے کہ کشفی صاحب کے خیالات کو ان کی ذات کے حوالے سے قبول کیا جاسکتا ہے مگر نظریہ شاعری کے طور پر نہیں۔ یہاں اس اظہار کی جرأت بھی لازم ہے کہ بعض اشعار کے نعتیہ ہونے کے بارے میں اُنھوں نے جس شک کا اظہار کیا ہے وہ درست نہیں۔ خاص طور پر اس شعر کے بارے میں:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

اس شعر پر صدیقی صاحب کا اعتراض ہے۔ ''شاعر اپنے کو آسمان کے برابر کس بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔'' (ص۱۵۴) اس بارے میں گزارش یہ ہے کہ ہماری شاعری میں تعلّی مبالغہ بلکہ لغو کی آخری حد کو چھوتی ہے۔ ویسے بھی اُردو، فارسی شاعری، نثر اور خطوط میں استعارہ بدل بدل کر اپنی فضیلت بیان کی ہے کوئی اگر نہ مانتا ہو تو نہ مانے غالب کا اپنے بارے میں جو خیال ہے اس سے اکثر اہلِ ذوق متفق ہیں۔ اسی شعر کے حوالے سے آسمان کا اشارہ بڑا بلیغ ہے۔ ایک طرف صاحبِ عظمت شاعر ہے دوسری طرف بلند و بالا آسمان ہے اور ذکر حضور سرورِ کونین ﷺ کا ہے۔ آسمان کو یہ شرف حاصل ہے کہ معراج کے مرحلوں میں ایسا مرحلہ بھی آیا کہ آسمان نے حضور اکرم ﷺ کے قدم چومے۔ آسمان کے لیے یہ اعزاز منفرد اور لاثانی ہے۔ حضور ﷺ کے سوا اس نے کسی کے قدم نہیں چومے۔ قدم چومنے کے اس فعل سے اس کا مرتبہ بڑھا۔ اب شاعر کی آرزو ہے کہ وہ بھی حضور ﷺ کے قدم چومے چاہے عالم ہوش میں ہو یا عالم

اسے ذات تک رکھیں۔ انسانی فکر کی پہنچ یا نظریہ خیال نہ کریں۔ یہی بحث ہے جو آگے بڑھی تو ایک اور مقالہ کے طور پر سامنے آئی ہے۔ ''نعت رنگ'' شمارہ:۹ میں ''غزل میں نعت کی جلوی گری'' کے عنوان سے اس میں اعادہ کیا گیا کہ

> جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد اور نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ (ص۱۳)

یہ ہمارا فرض نہیں اور نہ یہ وتیرہ ہونا چاہیے کہ ہم شاعر کو ایک دنیا سے اُٹھا کر دوسری دنیا میں پہنچادیں بلکہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ شعر کی بلندی اور لامحدودیت نے شاعر کی فکری رسائی کو حمد و نعت کی دنیا جیسی بنادیا ہے۔ اس مقالے میں اُنھوں نے غزلوں کے بے شمار اشعار درج کیے ہیں جن کا حوالہ مجاز کی بجائے ذاتِ حسن اور ذاتِ رسول ﷺ بنتے ہیں۔ محبِّ مکرم احمد صغیر صدیقی نے اس مضمون پر اعتراضات کرتے ہوئے۔ (''نعت رنگ'' شمارہ:۱۱) میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ بھی اس نکتہ کو نہیں پاسکے کہ کشفی صاحب کے خیالات کو ان کی ذات کے حوالے سے قبول کیا جاسکتا ہے مگر نظریہ شاعری کے طور پر نہیں۔ یہاں اس اظہار کی جرأت بھی لازم ہے کہ بعض اشعار کے نعتیہ ہونے کے بارے میں اُنھوں نے جس شک کا اظہار کیا ہے وہ درست نہیں۔ خاص طور پر اس شعر کے بارے میں:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

اس شعر پر صدیقی صاحب کا اعتراض ہے۔ ''شاعر اپنے کو آسمان کے برابر کس بنیاد پر کہہ سکتا ہے۔'' (ص۱۵۴) اس بارے میں گزارش یہ ہے کہ ہماری شاعری میں تعلّی مبالغہ بلکہ لغو کی آخری حد کو چھوتی ہے۔ ویسے بھی اُردو، فارسی شاعری، نثر اور خطوط میں استعارہ بدل بدل کر اپنی فضیلت بیان کی ہے کوئی اگر نہ مانتا ہو تو نہ مانے غالب کا اپنے بارے میں جو خیال ہے اس سے اکثر اہلِ ذوق متفق ہیں۔ اسی شعر کے حوالے سے آسمان کا اشارہ بڑا بلیغ ہے۔ ایک طرف صاحبِ عظمت شاعر ہے دوسری طرف بلند و بالا آسمان ہے اور ذکر حضور سرورِ کونین ﷺ کا ہے۔ آسمان کو یہ شرف حاصل ہے کہ معراج کے مرحلوں میں ایسا مرحلہ بھی آیا کہ آسمان نے حضور اکرم ﷺ کے قدم چومے۔ آسمان کے لیے یہ اعزاز منفرد اور لاثانی ہے۔ حضور ﷺ کے سوا اس نے کسی کے قدم نہیں چومے۔ قدم چومنے کے اس فعل سے اس کا مرتبہ بڑھا۔ اب شاعر کی آرزو ہے کہ وہ بھی حضور ﷺ کے قدم چومے چاہے عالم ہوش میں ہو یا عالم

استغراق میں۔ حضور ﷺ نے منع فرمادیا تو شاعر گلہ کررہا ہے کہ آپ نے آسمان کو قدم چومنے کی اجازت دے دی تھی کیا میں آسمان سے گیا گزرا ہوں کہ مجھے یہ اجازت مرحمت نہیں فرمائی جارہی ہے۔

بہرحال یہاں مقصد کشفی صاحب کے متذکرہ مضمون ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' کا حرف بہ حرف دفاع کرنا ہے نہ احمد صغیر صدیقی کے مضمون سے اختلاف۔ فیصلہ کسی حد تک احمد صغیر صدیقی نے کردیا ہے۔ اُنھوں نے لکھا ہے:

> میں اس حد تک جناب کشفی سے متفق ہوں کہ اُردو غزل کے بے شمار اشعار میں نعت کے اشعار جیسا رنگ ہے لیکن میں اس بات کی تائید نہیں کرسکتا کہ انھیں نعت کا شعر کہہ کر انھیں مشتہر کیا جائے۔
>
> (''نعت رنگ'' شمارہ۱۱، ص۱۰۷)

اس بیان کے ابتدائی حصے سے میں بھی متفق ہوں لیکن دوسرے حصے سے اتفاق نہ کرنے کی جسارت بھی کررہا ہے۔ صدیقی صاحب جن اشعار کو ''نعت کے جیسے رنگ'' میں شمار کرتے ہیں انھیں اگر کوئی نعتیہ اشعار باور کرلیتا ہے تو اس کے ذوق جذب و قبول پر کسی کو اعتراض کا حق جیسی جس کے گمان میں آئی کسی معاملے میں اپنی رائے کے اظہار کو اس کی تشہیر قرار دینا بھی مناسب نہیں۔

بات قدرے طویل ہوگئی۔ میں نے سطور بالا میں جس رائے کا اظہار کیا ہے اس پر میں قائم ہوں کہ افتادِ طبع، عمومی رجحان اور خاص موڈ میں شعر کا مفہوم جو سمجھ میں آئے وہ اپنی جگہ قابلِ اعتراض نہیں کہ انفرادی زاویہ نگاہ ہے۔ اسے عمومی نہ سمجھتے ہوئے بھی اظہارِ آزادی کے احترام میں اسے قبول کرلینے میں کوئی حرج نہیں۔ کشفی صاحب کے اکثر بیانات ان کے اپنے ذاتی خیالات پر مبنی ہیں۔ ضروری نہیں کہ ان کو عمومی صداقت کے طور پر تسلیم کیا جائے۔ اُنھوں نے لکھا ہے کہ:

> حضور ﷺ خیال واحد اور ایک موضوع کے طور پر ہماری زندگی اور یادوں میں نہیں آئے، وہ ہر حال میں شامل ہیں اور ہر جذبہ کا آہنگ اور ہر موضوع کا نمایاں پہلو ہیں۔ یوں صنف غزل ہی آپ کے ذکر کو ہمارے لیے ورد اور وظیفہ بنانے کا فریضہ ادا کرسکتی ہے اور کسی صنف میں یہ توانائی اور امکانات نہیں۔
>
> (''نعت رنگ''، شمارہ۹، ص۱۸)

بیان کے ابتدائی حصے میں ضمیر جمع ''ہماری'' استعمال کرکے کشفی صاحب نے گویا ایک عمومی صداقت پیش کی ہے۔ ان کی پاکیزگی فکر پر حرف لائے بغیر کہنا ضروری ہے کہ تمام شاعروں بلکہ تمام مسلمانوں کے شب و روز کی فکر و عمل پر بھی اس کی صداقت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ بہت ممکن ہے اور یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ کشفی صاحب کا ایمان اور ان کا طرزِ فکر اس کا انداز کا ہو کہ ان کی سوچ کا ہر زاویہ حضور ﷺ کی ذات پاک سے پیوند اخلاص و محبت رکھتا اور غزل جو اخلاص اور محبت کے اظہار (اور عمومیت سے جذبات اور ان کے سوز و گداز کا اظہار) کا ذریعہ ہے وہ مضامین نعت کے بلند تقدس اور پاکیزہ مضامین کا بار اُٹھانے کا معاملے میں دیگر اصناف سے زیادہ توانائی رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر غزل کی فضیلت اور نعت کی فضیلت کی یکسانیت سے غزل کے امکانات کا انکشاف ہوتا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ نعت کے بہترین شعر غزل کی ہیئت ظاہری میں بھی ملتے ہیں۔ مگر اس کلیہ یا نظریہ کی بنیاد جس بیان پر رکھی گئی وہ انفرادی رجحان کی مظہر ہے۔ عمومی صداقت نہیں ہے۔

اس مضمون (''غزل میں نعت کی جلوہ گری''، مشمولہ ''نعت رنگ'' شمارہ:۹) میں کشفی صاحب نے صنف غزل کے حوالے سے جن جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت وقیع ہیں۔ ان سے غزل کی عظمت اور اثر پزیری بھی ظاہر ہے اور خود صاحب مضمون کی تبحرِ علمی بھی۔ اس کی وضاحت کے لیے طویل بحث کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے اہم اقتباسات اپنی رائے کی تائید میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

> غزل کی توانائی اور امکانات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قصیدہ مسدس مثنوی، نظم کی مختلف ہیئتوں، نظم معریٰ اور نظم آزاد کے ہوتے آج بھی غزل ہمارے ادب کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف ہے اور ہمارے بہترین تخلیقی ذہنوں نے غزل کے ذریعے اپنا اظہار کیا ہے۔
>
> (''نعت رنگ''، شمارہ۹، ص۱۸)

غزل صرف ایک صنف سخن نہیں بلکہ ہماری ثقافت کی مظہر ہے۔ (ص۱۷)

ہماری ثقافت کیا ہے اس پر ہمارے نصب العین، ہمارے مقصدِ حیات اور ہماری طرزِ زندگی کی چھاپ ہے۔ مسلمان جو دینِ اسلام سے پیوند و رشتہ رکھتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو فراموش کرکے ثقافت کو استوار نہیں کرسکتا۔ فن شاعری اسی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے اس میں سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ جس میں وہ تصور بھی شامل

بیان کے ابتدائی حصے میں ضمیر جمع ''ہماری'' استعمال کر کے کشفی صاحب نے گویا ایک عمومی صداقت پیش کی ہے۔ ان کی پاکیزگی فکر پر حرف لائے بغیر کہنا ضروری ہے کہ تمام شاعروں بلکہ تمام مسلمانوں کے شب و روز کی فکر و عمل پر بھی اس کی صداقت کا شائبہ نظر نہیں آتا۔ بہت ممکن ہے اور یہ امر قابلِ تسلیم ہے کہ کشفی صاحب کا ایمان اور ان کا طرزِ فکر اس کا انداز کا ہو کہ ان کی سوچ کا ہر زاویہ حضور ﷺ کی ذات پاک سے پیوند اخلاص و محبت رکھتا اور غزل جو اخلاص اور محبت کے اظہار (اور عمومیت سے جذبات اور ان کے سوز و گداز کا اظہار) کا ذریعہ ہے وہ مضامین نعت کے بلند تقدس اور پاکیزہ مضامین کا بار اُٹھانے کا معاملے میں دیگر اصناف سے زیادہ توانائی رکھتی ہے۔ مجموعی طور پر غزل کی فضیلت اور نعت کی فضیلت کی یکسانیت سے غزل کے امکانات کا انکشاف ہوتا ہے اور واقعہ یہی ہے کہ نعت کے بہترین شعر غزل کی ہیئت ظاہری میں بھی ملتے ہیں۔ مگر اس کلیہ یا نظریہ کی بنیاد جس بیان پر رکھی گئی وہ انفرادی رجحان کی مظہر ہے۔ عمومی صداقت نہیں ہے۔

اس مضمون (''غزل میں نعت کی جلوہ گری''، مشمولہ ''نعت رنگ'' شمارہ:۹) میں کشفی صاحب نے صنف غزل کے حوالے سے جن جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نہایت وقیع ہیں۔ ان سے غزل کی عظمت اور اثر پزیری بھی ظاہر ہے اور خود صاحب مضمون کی تبحرِ علمی بھی۔ اس کی وضاحت کے لیے طویل بحث کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ ان کے اہم اقتباسات اپنی رائے کی تائید میں پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

> غزل کی توانائی اور امکانات کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ قصیدہ مسدس مثنوی، نظم کی مختلف ہیئتوں، نظم معریٰ اور نظم آزاد کے ہوتے آج بھی غزل ہمارے ادب کی سب سے اہم اور سب سے مقبول صنف ہے اور ہمارے بہترین تخلیقی ذہنوں نے غزل کے ذریعے اپنا اظہار کیا ہے۔
>
> (''نعت رنگ''، شمارہ۹، ص۱۸)

غزل صرف ایک صنف سخن نہیں بلکہ ہماری ثقافت کی مظہر ہے۔ (ص۱۷)

ہماری ثقافت کیا ہے اس پر ہمارے نصب العین، ہمارے مقصدِ حیات اور ہماری طرزِ زندگی کی چھاپ ہے۔ مسلمان جو دینِ اسلام سے پیوند و رشتہ رکھتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو فراموش کر کے ثقافت کو استوار نہیں کرسکتا۔ فن شاعری اسی ثقافت کی آئینہ دار ہے۔ غزل اُردو شاعری کی آبرو ہے اس میں سب کچھ سمایا ہوا ہے۔ جس میں وہ تصور بھی شامل ہے جو وجود ذات باری پر دلالت کرتا ہے وہ مدح و ثنا بھی شامل ہے جس کی مستحق ذات رسول پاک ﷺ کے سوا کوئی نہیں۔ غزل کی رمزیت، ایمائیت اس کے اظہار کا وسیلہ ہے۔ اُنھیں سے غزل کی مثالی اور ہمہ جہتی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سامع یا قاری کا شعور ہے کہ وہ کس اشاریت، علامت، تشبیہہ، استعارہ اور ابہام کو کس طرف لے جائے۔ غالب کے اشعار میں تصوف تلاش کرنا عام بات ہے۔ کشفی صاحب نے اپنے مزاج کے مطابق بعض اشعار میں نعت کی جلوی گری پائی تو تعجب کی کوئی بات نہیں۔ فیض نے اپنی دانست میں نعتیہ شعر کہے ان کی شاعری کے عمومی رنگ سے لوگ اتنے متاثر رہے کہ نعتیہ اشعار کو بھی مجازی اشعار سمجھتے رہے۔ ہر دو حالتوں میں ذہنی رجحان کی کارفرمائی ہے۔ یہ اہلِ علم کا کام ہے کہ وہ رمز کے پردوں میں چھپی صداقت کو افشا کرے، اس میں اختلاف اور مخالفت کے سخت مقام آتے ہیں۔ ان کے لیے برداشت اور گوارہ کرنے کی عادت بھی پروان چڑھانا ہوگی۔

کشفی صاحب کے ذوق علمی اور حبِ رسول ﷺ نے اُردو غزل میں نعت کے اہم اشعار منتخب کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ اس کی ذیل میں میر، غالب، اقبال، حسرت، فیض، احمد ندیم قاسمی، فضل کریم فضلی، سراج الدین ظفر کے ایسے اشعار پیش کیے ہیں جو واضح طور پر نعتیہ ہیں اور ایسے بھی جن کو کشفی صاحب نعتیہ سمجھتے ہیں۔ دوسری قسم کے اشعار کے لیے اُنھوں نے مناسب طور پر ''نعت صفتی'' ہونے کا اعلان کیا ہے اس طرح اُنھوں نے دونوں اقسام میں خود ہی ''حدِ فاصل'' قائم کردی ہے۔

''نعت گوئی اور نعت شناسی'' کے حوالے سے کشفی صاحب کا ایک مضمون ''نعت کے موضوعات'' کے عنوان سے ''نعت رنگ''، شمارہ:۶ میں چھپا۔ اس مضمون کے ابتدائی حصے میں اُنھوں نے لکھ دیا ہے کہ دوسرے ہی روز ان کی ارض مقدس کی روانگی کا قصد ہے اس لیے بات جامع نہیں بلکہ اجمالی ہوگی۔

اس میں اُنھوں نے جن موضوعات پر اظہارِ خیال ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(۱) مدینہ منورہ جانے کے ارادے، تمنا اور تڑپ کا اظہار۔ (ص۱۴ تا ۱۶)

(۲) مدینے سے اپنے تعلق کا ذکر مدینے کا جنت سے تقابل اور جنت کی تحقیر۔ (ص۱۶تا۱۸)

(۳) گنبدِ خضریٰ کا ذکر کرتے ہوئے کبوتروں کا ذکر

(۴) مضمون آفرینی کی کوشش

(۵) دوسروں سے الگ اپنی راہ تراشنے کا شوق

(۶) خواہ مخواہ علمیت کا اظہار اور الفاظ غریب کا شکار ہونا۔

(۷) حضرت جبرئیلؑ کی تحقیر۔

(۸) دیگر انبیائے کرام سے خواہ مخواہ تقابل اور ان کی شان میں گستاخی۔

(۹) اپنے آپ کو حسانِ ثانی سمجھنا۔

یہ تمام موضوعات وہ ہیں جو فی زمانہ نعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے چند قابلِ قبول اور محترم ہیں جو چند نچلی ذہنی سطح کے شاعروں کے ناقابلِ قبول کارنامے ہیں۔ ان سے حضورﷺ کی ذات کی روشنی میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ان سے محبت، عقیدت اور احترام میں بیشی ہوتی ہے۔ عموماً نعت کی حرمت اور مضمون کی عظمت کو نظر انداز کر کے شاعر بننے کے شوق میں جس جدت طرازی کا رواج عام ہو گیا اس پر سخت تنقید کی ضرورت ہے اور رسائل کے مدیران کرام اس رعایت کو ختم کر دیں کہ جن اشعار پر ''نعت'' لکھا ہو اس کی اشاعت لازم ہے۔

کشفی صاحب حرف شناس ہیں۔ لسانیات کے رموز سے واقف ہیں، فنِ شاعری اور اس کے تلازمے ان کی گرفت میں ہیں۔ نعت گوئی اور نعت شناسی کے مضمرات سے آگاہ ہیں اس لیے مضامین کو علمی درس کے طور پر پڑھنے میں لطف آتا ہے اور اس سے علمیت میں اضافہ کے ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا ذہن اکتسابی بھی ہے اور احتسابی بھی اس لیے اکثر باتوں کو اپنے فہم کی کسوٹی پر کسنے کے بعد جذب کرنے میں موانع رہتے ہیں اشکال اور اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ تفصیل میں گئے بغیر میں ان کے ایک بیان پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرشار صدیقی کے نعتیہ کلام کے مجموعے ''اساس'' میں شامل ان کی تحریر کردہ ''تقریظ'' میں، میں نے یہ جملے دیکھے:

(مدینہ) زمین کا مقدس ترین ٹکڑا ہے۔ حرم کعبہ سے زیادہ محترم

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰﷺ
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

(اساس: ص۹)

میں شاید مذہبی نکتہ نظر سے اس پر اظہار رائے کے منصب پر فائز نہیں لیکن اس حد تک تبصرے سے بھی گریز نہیں کر سکتا کہ بحیثیت ''مسلمان'' شعر پڑھ کر میرا ایمان متزلزل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

(۷) حضرت جبرئیلؑ کی تحقیر۔

(۸) دیگر انبیائے کرام سے خواہ مخواہ تقابل اور ان کی شان میں گستاخی۔

(۹) اپنے آپ کو حسانِ ثانی سمجھنا۔

یہ تمام موضوعات وہ ہیں جو فی زمانہ نعت میں شامل ہیں۔ ان میں سے چند قابلِ قبول اور محترم ہیں جو چند نچلی ذہنی سطح کے شاعروں کے ناقابلِ قبول کارنامے ہیں۔ ان سے حضور ﷺ کی ذات کی روشنی میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ان سے محبت، عقیدت اور احترام میں بیشی ہوتی ہے۔ عموماً نعت کی حرمت اور مضمون کی عظمت کو نظر انداز کر کے شاعر بننے کے شوق میں جس جدت طرازی کا رواج عام ہوگیا اس پر سخت تنقید کی ضرورت ہے اور رسائل کے مدیران کرام اس رعایت کو ختم کردیں کہ جن اشعار پر ''نعت'' لکھا ہو اس کی اشاعت لازم ہے۔

کشفی صاحب حرف شناس ہیں۔ لسانیات کے رموز سے واقف ہیں، فنِ شاعری اور اس کے تلازمے ان کی گرفت میں ہیں۔ نعت گوئی اور نعت شناسی کے مضمرات سے آگاہ ہیں اس لیے مضامین کو علمی درس کے طور پر پڑھنے میں لطف آتا ہے اور اس سے علمیت میں اضافہ کے ساتھ بصیرت بھی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن ہمارا ذہن اکتسابی بھی ہے اور احتسابی بھی اس لیے اکثر باتوں کو اپنے فہم کی کسوٹی پر کسنے کے بعد جذب کرنے میں موانع رہتے ہیں اشکال اور اختلاف کی صورتیں بھی پیدا ہوتی ہیں۔ زیادہ تفصیل میں گئے بغیر میں ان کے ایک بیان پر حیرت کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ سرشار صدیقی کے نعتیہ کلام کے مجموعے ''اساس'' میں شامل ان کی تحریر کردہ ''تقریظ'' میں، میں نے یہ جملے دیکھے:

(مدینہ) زمین کا مقدس ترین ٹکڑا ہے۔ حرم کعبہ سے زیادہ محترم

وہ زمیں ہے تو مگر اے خواب گاہ مصطفیٰ ﷺ
دید ہے کعبے کو تیری حج اکبر سے سوا

(اساس: ص۹)

میں شاید مذہبی نکتہ نظر سے اس پر اظہار رائے کے منصب پر فائز نہیں لیکن اس حد تک تبصرے سے بھی گریز نہیں کرسکتا کہ بحیثیت ''مسلمان'' شعر پڑھ کر میرا ایمان متزلزل ہوتے ہوتے رہ گیا۔

عزیز احسن

''نسبت'' احساس اور لطافت کا مرقع

روح لطیف ہے، جسم کثیف، انسان اسی لیے لطافت اور کثافت کا امتزاج ہے کہ:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کرنہیں سکتی

انسانی مزاج پر کثافت غالب آجائے تو وہ جوہر انسانیت سے محروم ہوجاتا ہے۔ لیکن جب اس پر لطافت کا غلبہ ہوتو یہی انسان ملکوتیت سے اتنا قریب ہوجاتا ہے کہ اپنے احساس، جذبے اور اپنی کیفیات کے اظہار کے لیے لفظ کا استعمال کرتے ہوئے بھی کتراتا ہے کہ لفظ اسے کثیف لگتے ہیں اور احساسِ لطافت کی شدت کے زیرِ اثر وہ لفظوں کے ڈھیر میں خود کو محبوس پاتا ہے۔

احساس کی دنیا میں یہ کیفیات جب صورتِ اظہار پاتی ہے تو کثیف لفظوں میں بھی لطیف جذبوں اور احساس کا کومل پن محسوس ہونے لگتا ہے۔ لفظ جذبوں اور احساس کی لطافتوں کے اظہار سے قاصر ہوتے ہیں تو شاعر اُن جذبوں اور احساسات کی صرف شبیہیں (Images) بنا دیتا ہے۔

الفاظ کے محبس میں خموشی رہی کشفی
کی اُن کی ثنا ہم نے مگر دیدۂ نم سے

احساس کی قندیل روشن ہوتی ہے تو مادی دنیا میں گزرنے والے لمحے انسان کو بکھرے ہوئے، بے ترتیب اور بے ہنگم لگنے لگتے ہیں اور انھی لمحوں میں وہ اپنے احساس کو انتشار کا شکار پاتا ہے۔ کثافت روحانی اطمینان برقرار نہیں رہنے دیتی۔ غلبۂ مادیت کے مظاہر احساس کو زخمی کردیتے ہیں لیکن روحِ شاعر کا روحِ محمدی علیٰ صاحبہا سے انسلاک شاعر کو سلامت رکھتا ہے۔

بکھرے ہوئے لمحوں میں سلامت ہیں دل و جاں
یہ تیری عطا ہے مرے مولا، مرے آقاؐ

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے لکھا ہے: ''جدید عہد کی بیماری یہ ہے کہ خدا اور بندے کے بارے میں محسوس کرنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہے''... اسلامی معاشروں میں اس بیماری کے مظاہر الحادی فکر کے فروغ کی شکل

میں ظاہر ہوئے۔ پاکستانی ادب بھی برسوں لادینی تحریکوں کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ صد شکر کہ ہماری شاعری میں ایک توانا رجحان حبِ رسول ﷺ کے اظہار کا ہر عہد میں موجود رہا ہے جس نے ہر عہد کی شاعری میں اپنے نقش قائم کیے ہیں۔ تاہم احساس کے تار اس طرح چھیڑنا کہ خدا اور بندے کو بہ توسطِ رسالت محسوس کیا جاسکے...صرف اچھی شاعری کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کیوں کہ بہ قول ورڈز ورتھ ''تمام اچھی شاعری شدید احساسات کا برجستہ اظہار ہے''...میرے خیال میں ابوالخیر کشفی کی شاعری اس کمی کو پورا کرسکتی ہے۔ ایسی شاعری کے ذریعے مذہبی احساس کے فقدان کا علاج ممکن ہے۔

مدینہ ایک شہر ہے۔ شہر اپنی حدود ثغور، ماڈّی ثروت مندی اور ثقافتی مظاہر سے پہچانا جاتا ہے۔ بلند و بالا عمارات، کاروباری مراکز، وسیع سڑکیں اور کشادہ گزرگاہیں۔ لیکن یہ خصوصیات تو دنیا کے کسی بھی شہر کی ہوسکتی ہیں۔ مدینے کی حیثیت، قلبِ مومن اور ہجر زدہ مسلمان کے لیے کیا ہے؟ اس کا بیان گلاب کی سی لطافت اور خرام نسیم کی سی صباحت چاہتا ہے۔ لیکن ماڈّی لفظ احساس کی روح قائم نہیں رکھ سکتے۔ اظہار کے مراحل طے کرتے ہوئے آبگینۂ احساس کی چمک دمک برقرار نہیں رہ سکتی۔ چناں چہ شاعر مدینے کا بیان نہیں کرتا...صرف ایک تاثر کو زبان دینے کی کوشش کرتا ہے

مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسنِ کلام
مدینہ حُسنِ ساعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

مدینے کی فضاؤں میں شاعر کی احساساتی دنیا اور تاریخی حوالے ذہن و دل پر وسیع تر منظر پیش کرتے ہیں۔ شاعر اپنے عہد کی آگاہی سے رنجور اور اپنی شناخت کی گم شدگی پر پشیمان ہے۔ سو اپنے ملجا و ماویٰ سے یہ التجا کرتا دکھائی دیتا ہے:

عثمانؓ و ابوبکرؓ و علیؓ کی تجھے سوگند
مل جائے مجھے میری خبر سیّدِ عالمؐ

اس التجا کے طفیل میں جب اُسے خود آگاہی کا لمحہ میسر آجاتا ہے تو اُس کا یہ احساس جاگتا ہے کہ انسانیت بڑی دُکھی ہے اور اُس کو کوئی مامنِ سکون اور مرکز شفقت درکار ہے لہٰذا وہ اپنی آواز قدرے بلند کرتا ہے اور پوری انسانیت سے مخاطب ہوکر خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے:

اس رحمتِ عالم کی عطا سب کے لیے ہے
سرکار ﷺ کی شفقت کی رِدا سب کے لیے ہے

شاعر کا وادیٔ نعت میں قدم رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے فکر و خیال کو عشقِ نبوی ﷺ کے تابع کرنے اور لفظ کو اس عشق کی روداد رقم کرنے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ''نسبت'' کی

میں ظاہر ہوئے۔ پاکستانی ادب بھی برسوں لادینی تحریکوں کے زیرِ اثر پروان چڑھا۔ صد شکر کہ ہماری شاعری میں ایک توانا رجحان حبِ رسول ﷺ کے اظہار کا ہر عہد میں موجود رہا ہے جس نے ہر عہد کی شاعری میں اپنے نقش قائم کیے ہیں۔ تاہم احساس کے تار اس طرح چھیڑنا کہ خدا اور بندے کو بہ توسطِ رسالت محسوس کیا جاسکے...صرف اچھی شاعری کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ کیوں کہ بہ قول ورڈز ورتھ ''تمام اچھی شاعری شدید احساسات کا برجستہ اظہار ہے''...میرے خیال میں ابوالخیر کشفی کی شاعری اس کمی کو پورا کرسکتی ہے۔ ایسی شاعری کے ذریعے مذہبی احساس کے فقدان کا علاج ممکن ہے۔

مدینہ ایک شہر ہے۔ شہر اپنی حدود ثغور، مادّی ثروت مندی اور ثقافتی مظاہر سے پہچانا جاتا ہے۔ بلند و بالا عمارات، کاروباری مراکز، وسیع سڑکیں اور کشادہ گزرگاہیں۔ لیکن یہ خصوصیات تو دنیا کے کسی بھی شہر کی ہوسکتی ہیں۔ مدینے کی حیثیت، قلبِ مومن اور ہجر زدہ مسلمان کے لیے کیا ہے؟ اس کا بیان گلاب کی سی لطافت اور خرامِ نسیم کی سی صباحت چاہتا ہے۔ لیکن مادّی لفظ احساس کی روح قائم نہیں رکھ سکتے۔ اظہار کے مراحل طے کرتے ہوئے آبگینۂ احساس کی چمک دمک برقرار نہیں رہ سکتی۔ چناں چہ شاعر مدینے کا بیان نہیں کرتا...صرف ایک تاثر کو زبان دینے کی کوشش کرتا ہے

مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسنِ کلام
مدینہ حُسنِ سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

مدینے کی فضاؤں میں شاعر کی احساساتی دنیا اور تاریخی حوالے ذہن و دل پر وسیع تر منظر پیش کرتے ہیں۔شاعر اپنے عہد کی آگاہی سے رنجور اور اپنی شناخت کی گم شدگی پر پشیمان ہے۔سو اپنے ملجا و ماویٰ سے یہ التجا کرتا دکھائی دیتا ہے:

عثمانؓ و ابوبکرؓ و علیؓ کی تجھے سوگند
مل جائے مجھے میری خبر سیّدِ عالمؐ

اس التجا کے طفیل میں جب اُسے خود آگاہی کا لمحہ میسر آجاتا ہے تو اُس کا یہ احساس جاگتا ہے کہ انسانیت بڑی دُکھی ہے اور اُس کو کوئی مامنِ سکون اور مرکزِ شفقت درکار ہے لہٰذا وہ اپنی آواز قدرے بلند کرتا ہے اور پوری انسانیت سے مخاطب ہوکر خود کلامی کے انداز میں کہتا ہے:

اس رحمتِ عالم کی عطا سب کے لیے ہے
سرکار ﷺ کی شفقت کی رِدا سب کے لیے ہے

شاعر کا وادیٔ نعت میں قدم رکھنا اس بات کی علامت ہے کہ اس نے فکر و خیال کو عشقِ نبوی ﷺ کے تابع کرنے اور لفظ کو اس عشق کی روداد رقم کرنے کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''نسبت'' کی

شاعری احساس کی شدت کی غماز ہے اور اس حقیقت کی آئینہ دار بھی کہ شاعر نے قلبی واردات کے اظہار کے مرحلے پر برجستگی کا خاص خیال رکھا ہے۔شعر لطافتِ اظہار کے ساتھ سچائی کا بھی تقاضا کرتا ہے۔شعر تخلیقی لمحات میں شعور کی براہِ راست مداخلت سے شعر نہیں رہتا بلکہ بیان یا نعرہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جس جذبے کا اظہار مطلوب ہو اس جذبے کو خود پر طاری کرنے کی شعوری کوشش بھی شعر کو غیر شعر بنا دیتی ہے۔ نعتیہ شاعری میں جذبے، کیفیت اور احساس کے بیان میں کذب کی ذرا سی شرکت بھی شاعری کے لیے سم قاتل ہے۔ سیّد ابوالخیر کشفی اس نازک ذمہ داری سے آگاہ ہیں اس لیے ان کے اشعار میں برجستگی (Spontaneity) کا عنصر بدرجۂ اتم موجود ہے اور اشعار کے متن (Text) میں صداقتوں کی روشنی بھی۔ دیکھیے اُنھوں نے کتنی سچی بات کس قدر خوب صورتی سے کہی ہے:

حُسنِ تقدیرِ بشر آپ ﷺ سے وابستہ ہے

ایک شعر میں اس صداقت کو ایک وسیع تناظر میں متنِ شعر بنایا ہے:

تاریخ محمد ﷺ کا نشانِ کفِ پا ہے
انسان کو معراج ملی اُن کے قدم سے

شعر اپنے خالق کی فکری روش کا عکاس ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنے نظریۂ فن اور شعری آدرش کے مطابق شاعری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ الگ بات کہ اس کوشش میں کامیابی کسی کسی کو ہی میسر آتی ہے۔ کشفی صاحب کی شاعری کی قرأت کے لمحوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ ان کی شاعری ان کے نظریۂ فن کی بھرپور عکاسی کرتی ہے کیوں کہ ان کا شعری نظریہ ان کی تخلیقی دانش کا جزو بن چکا ہے۔ نسبت میں ''پیش گفتار'' کے زیرِ عنوان جو کچھ لکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل شاعری اس تحریر کے مافیہ (Content) کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔ کشفی صاحب لکھتے ہیں:

> نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان ﷺ کی خدمتِ عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شاید حضوری کا یہ لمحہ ہمیں حرف و صوت کی دنیا میں کبھی مل جائے!

اس بیان کی روشنی میں یہ اشعار ملاحظہ ہو:

مرا وجود محمد ﷺ کے نام سے قائم
چراغِ کعبہ سے روشن ہیں سب ہنر میرے
میرے اشکوں سے بنے گنبدِ خضریٰ کی شبیہ
تیری رحمت ہو عطا دیدۂ نم کی صورت
اُن ﷺ کی اُمت کا فرد ہے کشفی

ایک اذنِ عطا ہے آنکھوں میں

نعت میں مخاطبہ، اہلِ فکر ونظر کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور حضوراکرم ﷺ سے براہِ راست تخاطب تو ذرا سی بھی درازنفسی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی مواقع پر شعرا کو پرکھا اور قادرالکلامی کا غرّہ رکھنے والے مُدَمّغ اساتذہ کو جانچا جاتا ہے۔ کشفی صاحب نے اس مرحلے پر وہ شبیہ (Image) بنائی ہے کہ لفظی تصویرکشی پر مصور کو بھی رشک آنے لگے۔ نوا، غیرمجسم اور مجرد (Abstract) ہے اسے گنبدِخضریٰ کے گرد تنہا اُڑنے والے پرندے سے تشبیہ دے کر اُنھوں نے پورا منظر بھی Visualize کروا دیا ہے اور اپنے احساس کو نوا دے کر اپنے آقا و مولا ﷺ سے مخاطبے کے ضمن میں درکار ادب واحترام بھی برقرار رکھا ہے۔ شاعری کی مصوری پر فوقیت ثابت کرنے کے لیے ایسے ہی اشعار کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائر تنہا
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

مخاطبہ کا حُسن مزید ملاحظہ ہو:

حضور! حجرۂ تاریک میں مری آنکھیں
قلم کو صفحۂ کاغذ پہ دیکھ کر رقصاں
نئی بصارت و توفیق کی شہادت ہیں

بعض مصرے فنی پختگی اور شعری سلیقہ مندی کی وجہ سے پورے پورے اشعار بلکہ نظموں پر بھاری دکھائی دیتے ہیں، مثلاً:

حُسن تقدیرِ بشر آپ ﷺ سے وابستہ ہے

اس مصرعے کی قرأت دوطرح سے کی جاسکتی ہے۔ حضور ﷺ سے مخاطبے کے انداز میں اور بنی نوع انسان سے تخاطب کی صورت میں۔ اول الذکر قرأت میں التجا پوشیدہ ہے اور استمداد کا کنایہ موجود ہے۔

☆...حضور ﷺ بشر کی تقدیر کا سنورنا آپ ہی کی نگاہِ عنایت پر موقوف ہے۔

ثانی الذکر قرأت میں ایک نعرہ مستانہ مضمر ہے۔

☆ ...یاایھا الناس... اے گروہِ انسان! سن رکھو کہ تمھاری تقدیروں کا سنورنا حضوراکرم ﷺ کے دامنِ عاطفت میں آنے پر موقوف ہے۔

اس طرح ایک ہی مصرعے کی خطابیہ اور خبریہ دونوں شکلوں میں قرأت کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح درج ذیل مصرعے اپنے ابلاغ کے لیے دوسرے مصرعوں کے محتاج نہیں ہیں:

ایک اذنِ عطا ہے آنکھوں میں

نعت میں مخاطبہ، اہلِ فکر ونظر کے لیے بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے اور حضور اکرم ﷺ سے براہِ راست تخاطب تو ذرا سی بھی دراز نفسی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ایسے ہی مواقع پر شعرا کو پرکھا اور قادرالکلامی کا غرّہ رکھنے والے مُدَمّغ اساتذہ کو جانچا جاتا ہے۔ کشفی صاحب نے اس مرحلے پر وہ شبیہ (Image) بنائی ہے کہ لفظی تصویرکشی پر مصور کو بھی رشک آنے لگے۔ نوا، غیر مجسم اور مجرد (Abstract) ہے اسے گنبدِ خضریٰ کے گرد تنہا اُڑنے والے پرندے سے تشبیہ دے کر اُنھوں نے پورا منظر بھی Visualize کروا دیا ہے اور اپنے احساس کو نوا دے کر اپنے آقا و مولا ﷺ سے مخاطبے کے ضمن میں درکار ادب و احترام بھی برقرار رکھا ہے۔ شاعری کی مصوری پر فوقیت ثابت کرنے کے لیے ایسے ہی اشعار کی مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

وہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائر تنہا
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقاؐ

مخاطبہ کا حُسن مزید ملاحظہ ہو:

حضور! حجرۂ تاریک میں مری آنکھیں
قلم کو صفحۂ کاغذ پہ دیکھ کر رقصاں
نئی بصارت و توفیق کی شہادت ہیں

بعض مصرعے فنی پختگی اور شعری سلیقہ مندی کی وجہ سے پورے پورے اشعار بلکہ نظموں پر بھاری دکھائی دیتے ہیں، مثلاً:

حُسن تقدیرِ بشر آپ ﷺ سے وابستہ ہے

اس مصرعے کی قرأت دو طرح سے کی جاسکتی ہے۔ حضور ﷺ سے مخاطبے کے انداز میں اور بنی نوع انسان سے تخاطب کی صورت میں۔ اول الذکر قرأت میں التجا پوشیدہ ہے اور استمداد کا کنایہ موجود ہے۔

☆...حضور ﷺ بشر کی تقدیر کا سنورنا آپ ہی کی نگاہِ عنایت پر موقوف ہے۔

ثانی الذکر قرأت میں ایک نعرہ مستانہ مضمر ہے۔

☆ ...یاایھا الناس... اے گروہِ انسان! سن رکھو کہ تمھاری تقدیروں کا سنورنا حضور اکرم ﷺ کے دامنِ عاطفت میں آنے پر موقوف ہے۔

اس طرح ایک ہی مصرعے کی خطابیہ اور خبریہ دونوں شکلوں میں قرأت کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح درج ذیل مصرعے اپنے ابلاغ کے لیے دوسرے مصرعوں کے محتاج نہیں ہیں:

اس چہرۂ اقدس کی ضیا سب کے لیے ہے
یا
دامانِ رسالت کی ہوا سب کے لیے ہے

قرأتوں کی تبدیلی کے حسن، مصرعوں کی جامعیت اور اعجاز بیان کے علاوہ ان مصرعوں کے مافیہ (Content) کو پرکھا جائے تو سارے زمانوں کی گواہی ملتی ہے کہ بات حق و صداقت پر مبنی ہے۔ عہدِ حاضر میں بنی نوع آدم کی توجہ اس سچائی کی طرف مبذول کروانے سے بہتر کوئی اور عمل ہو بھی نہیں سکتا۔ تبلیغ دینِ متین کے لیے ایسی شاعری کی ضرورت ہے جو نعرہ بازی کی بلند آہنگی اور اس کی کم اثری سے محفوظ ہو۔ اس طرح شعر کا ادبی حسن اور شعری جمال نہ صرف قائم رہتا ہے بلکہ مذہبی تقدس بھی برقرار رہتا ہے۔ اب ذرا دیکھیے اس خطابیے میں کس قدر زندہ حقیقت جزوِ ہنر بنی ہے۔

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشتِ خاک تری جستجو میں زندہ ہے

بات اگر استفہامیہ انداز سے کہی جائے اور ایسی حقیقتیں پیش کی جائیں جن کا ادراک ایک طرف کشفِ حجاب کا باعث ہوسکے اور دوسری بالاشتباہ حقیقت تک رسائی بھی ممکن ہے تو اس اندازِ مخاطب کو مناظرانہ بلند آہنگی کے سُقم سے اُسی صورت میں بچایا جاسکتا ہے۔ جب شعری جمالیات کا بھرپور احساس قائم رہ سکے اور لہجہ ملیح اور دھیمہ ہو۔ استفہام اقراری کا ایسا ہی نمونہ درج ذیل اشعار میں دیکھا جاسکتا ہے:

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟ — افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟
کس نام سے ملتی ہے شفا اہلِ جہاں کو — کونین کو یہ حرفِ دعا کس سے ملا ہے؟
ہر نقش میں اک شانِ کریمی ہے خدا کی — یہ پردۂ انوار و ضیا کس سے ملا ہے؟
یہ دولتِ اندازِ نظر کس کا کرم ہے — یہ سلسلۂ فکرِ رسا کس سے ملا ہے؟
جز احمدِ مختار ﷺ کے نقشِ کفِ پا کے
انسان کو یہ نورِ خدا کس سے ملا ہے؟

اس استفہام اقراری میں یہ شعری صباحت اور یہ فنی نفاست اس لیے پیدا ہوسکی کہ شاعر نے اس میں لوگو! بھائیو! دوستو! تم ہی کہو جیسے خطابیہ ضمائر استعمال نہیں کیے ہیں۔ شاعر کا استفہامیہ لہجہ تاثراتی ہے اور فکری

استغراق کی نشان دہی کر رہا ہے۔

مزید براں اس میں صدق و صفا، حیا، دعا، ضیا اور فکرِ رسا جیسی لطیف علامتوں کے نقوش بنے ہیں جن کے لہجے کی نرمی، اظہار کے شاعرانہ پن اور احساس کی لطافت کی عکاس ہے۔

انسانیت سیرتِ سرکار دوعالم ﷺ کے دائمی استمرار (Perpetuality) سے فیض یاب ہوتی رہے، یہی منشائے ربّ العالمین ہے۔ اسی منشا کو پورا کرنے کی غرض سے قرآن کریم میں فرمایا گیا ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اُسوۃ حسنہ'' تحقیق اللہ کے رسول (کی حیاتِ طیبہ) میں تمھارے لیے بہترین نمونہ (عمل) موجود ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی ارشاد ربانی کے تحت اس بات کا مکلّف ہے کہ اس میں ہر لمحہ ہر ساعت، ہر عہد اور ہر منطقے میں ایسے لوگ موجود رہیں جن کی سیرت اسوۂ ختم الرسل ﷺ کی جھلک رکھتی ہو تاکہ ہر عہد میں سعید روحیں ان کے عمل سے متاثر ہوکر صراطِ مستقیم پر چلنے کا فیصلہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ سے آج تک ہر عہد میں مردانِ کار موجود رہے جن سے انسانیت نے عمل کی راہیں اور حسن کردار کی ادائیں سیکھی ہیں۔ اسلامی ادب میں منقبت نگاری کا رجحان بھی اسی تاثر پذیری کے تحت پیدا ہوا ہے۔ نعت گوئی کے ہنگام میں جب رجال الملت کا تصور قائم ہوجائے اور طبیعت ان کے کردار کی اس لیے تعریف کرنے پر مائل ہو کہ اُنھوں نے اپنی سیرتوں کو جگمگانے کے لیے سراجِ منیر ﷺ سے روشنی کی خیرات مانگی تھی جو انھیں عطا ہوگئی، تو منقبت کے ایسے اشعار وجود میں آجاتے ہیں جن سے اسوۂ رسول ﷺ کا دائمی استمرار مترشح ہوتا ہے:

میرے سیّد، مرے حامد پہ کرم ہو یا رب
فیضِ احمد ﷺ سے جو قرآں پہ نظر رکھتے ہیں
(سیّد حامد حسن، بلگرامی مدظلہ)

شہر طیبہ میں ملے حضرتِ شرقی ہم کو
وہ جو سرکار کی مدحت کا ہنر رکھتے ہیں
(سیّد عبدالعزیز، شرقی مرحوم)

تم غلامانِ محمد ﷺ سے ملو تو کشفی

استغراق کی نشان دہی کر رہا ہے۔

مزید براں اس میں صدق و صفا، حیا، دعا، ضیا اور فکر رِسا جیسی لطیف علامتوں کے نقوش بنے ہیں جن کے لہجے کی نرمی، اظہار کے شاعرانہ پن اور احساس کی لطافت کی عکاس ہے۔

انسانیت سیرتِ سرکار دوعالم ﷺ کے دائمی استمرار (Perpetuality) سے فیض یاب ہوتی رہے، یہی منشائے ربّ العالمین ہے۔ اسی منشا کو پورا کرنے کی غرض سے قرآن کریم میں فرمایا گیا ''لقد کان لکم فی رسول اللّٰہ اُسوۃ حسنہ'' تحقیق اللہ کے رسول (کی حیاتِ طیبہ) میں تمھارے لیے بہترین نمونۂ (عمل) موجود ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی ارشاد ربانی کے تحت اس بات کا مکلف ہے کہ اس میں ہر لحہ ہر ساعت، ہر عہد اور ہر منطقے میں ایسے لوگ موجود رہیں جن کی سیرت اسوۂ ختم الرسل ﷺ کی جھلک رکھتی ہو تا کہ ہر عہد میں سعید روحیں ان کے عمل سے متاثر ہوکر صراطِ مستقیم پر چلنے کا فیصلہ کرسکیں۔ یہی وجہ ہے کہ عہدِ نبوی ﷺ سے آج تک ہر عہد میں مردانِ کار موجود رہے جن سے انسانیت نے عمل کی راہیں اور حسن کردار کی ادائیں سیکھی ہیں۔ اسلامی ادب میں منقبت نگاری کا رجحان بھی اسی تاثر پذیری کے تحت پیدا ہوا ہے۔ نعت گوئی کے ہنگام میں جب رجال الملت کا تصور قائم ہوجائے اور طبیعت ان کے کردار کی اس لیے تعریف کرنے پر مائل ہو کہ اُنھوں نے اپنی سیرتوں کو جگمگانے کے لیے سراجِ منیر ﷺ سے روشنی کی خیرات مانگی تھی جو انھیں عطا ہوگئی، تو منقبت کے ایسے اشعار وجود میں آجاتے ہیں جن سے اسوۂ رسول ﷺ کا دائمی استمرار مترشح ہوتا ہے:

میرے سیّد، مرے حامد پہ کرم ہو یا رب
فیضِ احمد ﷺ سے جو قرآں پہ نظر رکھتے ہیں
(سیّد حامد حسن، بلگرامی مدظلہ)

شہرِ طیبہ میں ملے حضرتِ شرقی ہم کو
وہ جو سرکار کی مدحت کا ہنر رکھتے ہیں
(سیّد عبدالعزیز، شرقی مرحوم)

تم غلامانِ محمد ﷺ سے ملو تو کشفی
وہ تو احوالِ دو عالم کی خبر رکھتے ہیں

حضورِ پُرنور سیّد عالم ﷺ نے اپنی ازواجِ مطہرات سے محبت اور حسنِ سلوک کا جو عملی مظاہرہ فرمایا ہے اس میں امت کے لیے یہ پیغام ہے کہ عائلی زندگی خوش گوار بنانے اور معاشرے میں راست اقدار کی ترویج کے لیے زوجین میں باہمی محبت پرواں چڑھتی رہے۔ ''نسبت'' میں ایسی شاعری کے نمونے بھی موجود ہیں جو ایک پاکیزہ خیال اور انسانی رشتوں کی اہمیت کا دینی سطح پر ادراک رکھنے والے شوہر کی فکری راست سمتی کے آئینہ دار ہیں۔ نعت گوئی کے الہامی لمحوں میں جہاں جہاں کشفی صاحب کو اپنی اہلیہ کا خیال آیا ہے اُنھوں نے اپنی التماس میں اپنی شریکِ زندگی کا نام ضرور شامل کیا ہے۔

بلقیس کے ہونٹوں پہ ترے نام کا نغمہ　　اس پر بھی عنایت کی نظر سیّدِ عالم
کعبہ کے مقابل تجھے دیکھا ہے نظر نے　　ہاں ربِ محمد ﷺ کی عطا تیرے لیے ہے
ماؤں کی ردا سایۂ الطافِ الٰہی　　صدیقؓ کی بیٹی کی حیا تیرے لیے ہے
ہر لحہ ترے لب پہ درود اور ثنا ہے　　خاصانِ محمد ﷺ کی دعا تیرے لیے ہے

بلقیس بھی کشفی بھی پریشان ہیں دونوں
اب ربِ محمد ﷺ کی عنایت پہ نظر ہے

اس کے علاوہ ایک دعا، ایک نعت کشفی اور بلقیس کی طرف سے، ایک گواہی بلقیس کے لیے... ایسی تخلیقات ہیں جن میں انسانی رشتوں کے پاکیزہ جذبات کی عکس گری کی گئی ہے۔ اس حوالے کی وجہ سے نعت کو عملی زندگی سے قریب تر لانے کی کوشش کرنے والے شعرا میں کشفی صاحب کو اوّلیت حاصل ہے۔

تلمیح سے حسنِ شعر میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اس کی تفہیم کے لیے تاریخ سے آگاہی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے تلمیح کی شعر میں اس طرح کی بُنت کو پسند کیا جاتا ہے کہ اگر تلمیحی اشارہ نہ بھی سمجھا جائے تب بھی شعر کا ابلاغ بھرپور ہوسکے۔ مثلاً:

چوڑی بجتی ہے تو برکت کی صدا آتی ہے
مرضیٔ شاہِ ہدیٰ رنگِ حنا میں شامل

اس شعر میں تلمیحی اشارہ بھی ہے اور اسلامی ثقافت کا نسائی عنصر بھی اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے... لیکن شعر کا ابلاغ تفہیم تلمیح کا محتاج نہیں ہے۔

نسائی جذبات کی نقش گری کے لحاظ سے جو اختصاص شاعر نسبت کو حاصل ہے اس کا مظاہرہ جابجا ہوا ہے۔ شاعر نے مواجہ شریف پر ایک آواز سنی اور اسے غالب کے مشہور مصرع:

ہزار بار بروصد ہزار بار بیا

کے قالب میں ڈھلتے دیکھا چناں چہ اس موقع پر بھی اس نے نسائی احساسات کی ترجمانی کا فریضہ انجام

دیا۔

کسی نقاب کے دامن میں جگنوؤں کی چمک حیا و عفت و ایماں کی ترجماں بن کر
فضائے صحنِ حرم میں دکھائی دیتی ہے ان آنسوؤں کی چمک کو یہی پیام ملا
''ہزار بار بروصد ہزار بار بیا''

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے...''عظیم ترین شعرا کے ہاں ایسے پہلو ہوتے ہیں جو فوراً سامنے نہیں آتے بلکہ صدیوں بعد بھی وہ دوسرے شعرا کو متاثر کر کے زندہ زبان پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔''... مواجہ شریف پر بظاہر بے محل غالب کا اک مصرع شاعر کو یاد آ کر کتنی سچائیاں منکشف کر گیا۔کشفی کی شاعری کا یہ رُخ بھی بڑا جاندار ہے۔ درج ذیل اشعار بھی غالب کی شعری اثریت کے آئینہ دار ہیں:

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے تعبیر بنا گنبدِخضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہِ شاہ مدینہ مرے آگے

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا تذکرہ نعت نگاروں نے کیا ہے اور کیوں نہ ہو جب خود رسول اللہ ﷺ نے اس ذکر کو پسند فرمایا ہے۔ ایک شادی کے موقع پر کچھ لڑکیاں دف بجا کر شہدائے بدر کی شجاعت کا نغمہ گا رہی تھیں۔ایک لڑکی نے گرہ لگائی۔ہم میں ایسا نبی ﷺ موجود ہے جو کل کو ہونے والے بات کی خبر دیتا ہے۔ رسول گرامی ﷺ نے فرمایا:''یہ بات مت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ۔''

اس روایت سے جہاں بعض شرعی نکات مستنبط ہوئے ہیں وہیں صحابہ کرامؓ کے تذکرے سے آپ ﷺ کی خوش نودی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راست فکر رکھنے والے تمام نعت گو شعرا نے مدحِ مصطفیٰ ﷺ میں مناقبِ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو بھی شامل رکھا ہے۔کشفی صاحب کے ہاں بھی نعت کی یہی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے:

ہے ان کی نظر نقش گر عہدِ رسالت میزانِ جہاں، حلقۂ یارانِ محمد ﷺ
اپنے صاحب کی رفاقت کا نشاں ہیں صدیقؓ ہر نفس صاحبِ ایثار کی یاد آتی ہے
حق و باطل کو جدا کردیا جس نے کشفی شاہِ لولاک کی تلوارؓ کی یاد آتی ہے
جس نے قرآن کے اوراق کو سرخی بخشی آج اس دیدۂ گل بار کی یاد آتی ہے
اپنے دشمن کے جو سینے سے اُتر آیا تھا
اس جری حیدرِ کرار کی یاد آتی ہے

☆

تاریخ و تمدن کی میزان وہی ٹھہرے اصحاب محمد ﷺ ہی معیار نظر آئے

دیا۔

کسی نقاب کے دامن میں جگنوؤں کی چمک   حیا و عفت و ایماں کی ترجماں بن کر
فضائے صحنِ حرم میں دکھائی دیتی ہے   ان آنسوؤں کی چمک کو یہی پیام ملا

''ہزار بار بروصد ہزار بار بیا''

ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ نے ایک جگہ کہا ہے... ''عظیم ترین شعرا کے ہاں ایسے پہلو ہوتے ہیں جو فوراً سامنے نہیں آتے بلکہ صدیوں بعد بھی وہ دوسرے شعرا کو متاثر کر کے زندہ زبان پر اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔''... مواجہ شریف پر بظاہر بے محل غالب کا اک مصرع شاعر کو یاد آ کر کتنی سچائیاں منکشف کر گیا۔ کشفی کی شاعری کا یہ رُخ بھی بڑا جاندار ہے۔ درجِ ذیل اشعار بھی غالب کی شعری اثریت کے آئینہ دار ہیں:

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے   تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے

افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہِ شاہ مدینہ مرے آگے

صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کا تذکرہ نعت نگاروں نے کیا ہے اور کیوں نہ ہو جب خود رسول اللہ ﷺ نے اس ذکر کو پسند فرمایا ہے۔ ایک شادی کے موقع پر کچھ لڑکیاں دف بجا کر شہدائے بدر کی شجاعت کا نغمہ گا رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے گرہ لگائی۔ ہم میں ایسا نبی ﷺ موجود ہے جو کل کو ہونے والے بات کی خبر دیتا ہے۔ رسول گرامی ﷺ نے فرمایا: ''یہ بات مت کہہ اور جو تو پہلے کہتی تھی وہی کہہ۔''

اس روایت سے جہاں بعض شرعی نکات مستنبط ہوئے ہیں وہیں صحابہ کرامؓ کے تذکرے سے آپ ﷺ کی خوش نودی بھی ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راست فکر رکھنے والے تمام نعت گو شعرا نے مدحِ مصطفےٰ ﷺ میں مناقبِ صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو بھی شامل رکھا ہے۔ کشفی صاحب کے ہاں بھی نعت کی یہی روایت آگے بڑھتی ہوئی نظر آتی ہے:

ہے ان کی نظر نقش گرِ عہدِ رسالت   میزانِ جہاں، حلقۂ یارانِ محمد ﷺ
اپنے صاحب کی رفاقت کا نشاں ہیں صدیقؓ   ہر نفس صاحبِ ایثار کی یاد آتی ہے
حق و باطل کو جدا کر دیا جس نے کشفی   شاہِ لولاک کی تلوارؓ کی یاد آتی ہے
جس نے قرآن کے اوراق کو سرخی بخشی   آج اس دیدۂ گل بار کی یاد آتی ہے

اپنے دشمن کے جو سینے سے اُتر آیا تھا
اس جری حیدرِ کرار کی یاد آتی ہے

☆

تاریخ و تمدن کی میزان وہی ٹھہرے   اصحابِ محمد ﷺ ہی معیار نظر آئے

صداقتِ دلِ صدیقؓ ہے چراغِ وجود
ادائے عشقِ بلالیؓ لہو میں زندہ ہے

اس مجموعے میں صحابہ کرامؓ کی محبت کے جواہر جگہ جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ مناقب صحابہؓ کے ان شعری مرقعوں میں حسن صداقت بیان، تاریخ انسانیت کے تاب ناک لمحوں کی جھلک، تنویر سیرت صحابہؓ سے کسبِ نور کرنے کی تڑپ۔ اسوۂ رسولِ اکرم ﷺ کے زمانی پھیلاؤ کی عکاسی اور شعری جمال سب ہی کچھ تو مل جاتا ہے:

مرے اشکوں میں تصویرِ بلالیؓ
محبت کا ہنر ہے اور میں ہوں

شاعر کی تخلیقی اپج اور ایجاد پسندی نے اظہار کی ایک جداگانہ راہ بھی نکالی ہے اور شعر کی اس ہیئت (Form) کو ''یک مصرعی نظم'' کا نام دیا ہے۔ ایجاز و اختصار۔ شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ عربی کہاوت ''خیر الکلام ماقل و دل '' بہترین کلام مختصر اور مراد کو ظاہر کرنے والا ہوتا ہے۔ ان معروضات کی روشنی میں یک مصرعی شبیہیں (Images) ملاحظہ فرمایئے:

دیباچۂ نشاطِ ابد اس کی ہر گلی
(مدینۃ النبی ﷺ)

خالِ رخِ ایام یہی بیتِ خدا ہے
(کعبۃ اللہ)

''نسبت'' میں شامل کلام میں اصنافِ سخن کا تنوع بھی ہے اور جدید و قدیم اصنافِ سخن کا امتزاج بھی مثلاً اس میں نعتیہ ہائیک، نعتیہ واکا، آزاد اور معریٰ نظمیں اور عربی نظموں کے تراجم تب و تابِ سخن کا منظر ہیں۔ کشفی صاحب کے لہجے کی متانت، کربِ دروں، شدتِ احساس سوزِ عشقِ نبوی ﷺ کی علامت ہے۔ اس شاعری سے عظمتِ رسالت، مقصد نبوت اور وحی ربانی کی اہمیت کا تاثر اُبھرتا ہے۔ شخصی تداخل (Personal Involvement) کی ایسی مثالیں اُردو نعتیہ شاعری میں کم کم دیکھنے میں آتی ہیں جیسی ''نسبت'' کے اوراق میں ضوریز ہیں۔

یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ شاعری کے بازار ہوس میں جب کہ ہر شخص کے سر میں اشعار کی کثرت اور کتابوں کی تعداد بڑھانے کا سودا سمایا ہوا ہے (معیار تو کسی کسی ہی کے پیش نظر رہتا ہے) کشفی صاحب نے ۱۹۹۹ء کے اختتام پر ۹۲ صفحات پر مشتمل نعتیہ مجموعہ چھپوایا ہے جس میں کل ۶۱ شعری مرقعے ہیں جب کہ اس شاعری کا دورانیہ (Span of time) ۱۹۵۵ء سے ۱۹۹۹ء تک ۴۴ سال کو محیط ہے۔ کمال یہ ہے کہ شاعر نے جس اسلوب (Style) تک ۱۹۵۵ء میں رسائی حاصل کر لی تھی بقیہ مدت اس اسلوب کے

معیار کو برقرار رکھنے میں صرف کی۔ طبیعت کا یہ ٹھہراؤ احساس کی یہ پختگی، اسلوب کی اس درجہ نگہداشت اور معیار کی اتنی نگہبانی... پھر احوال و کیفیات کا یہ تسلسل بہت کم شعری مجموعوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ شاعری اپنی ادبی خوبیوں، طرزِ احساس، اسلوب کی دل کشی، بیان کی متانت اور مقامِ رسالت کی عظمتوں کے خاص شعور کے باعث وحدتِ تاثر (Unity of Impression) کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اچھے شاعر کی کچھ خصوصیات گنائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''وہ انھیں (لوگوں کو) ان احساسات سے جو وہ پہلے سے محسوس کر رہے ہیں اور زیادہ باخبر کردیتا ہے اور اس طرح انھیں اپنی ذات سے بھی زیادہ باخبر کردیتا ہے وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے روشناس کرادیتا ہے جو اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے تھے''...نسبت کے مطالعے سے بھی ایک باشعور قاری پر یہ منکشف ہوگا کہ اس نے احساس کی دنیا میں اپنی دریافت کی ایک نئی جہت (New Dimention) کو پا لیا ہے یا ایک بلند زینہ طے کرلیا ہے۔

ایک تعریف کی رو سے ''شعر کلام کو کہتے ہیں جو بالقصد موزوں کیا گیا ہو''...نسبت کی شاعری پڑھ کر ایک تمنا جنم لیتی کہ کاش شاعر بالقصد شعر کہنے کی طرف مائل ہوتا! ایسا کرنے سے وہ شاعری کی دنیا میں اس سے کہیں زیادہ معروف ہوتا جتنا معروف اپنی مختلف الجہات ادبی خدمات کے حوالے سے آج ہے...

بہرحال وجدان اب بھی اس شاعری پر دوام کے روزن، مقبولیت کے دریچے اور ادبی سطح پر پذیرائی کے در کھلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

معیار کو برقرار رکھنے میں صرف کی۔ طبیعت کا یہ ٹھہراؤ احساس کی یہ پختگی، اسلوب کی اس درجہ نگہداشت اور معیار کی اتنی نگہبانی... پھر احوال و کیفیات کا یہ تسلسل بہت کم شعری مجموعوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ شاعری اپنی ادبی خوبیوں، طرزِ احساس، اسلوب کی دل کشی، بیان کی متانت اور مقامِ رسالت کی عظمتوں کے خاص شعور کے باعث وحدتِ تاثر (Unity of Impression) کا ایک اچھا نمونہ ہے۔

ٹی۔ایس۔ایلیٹ نے اچھے شاعر کی کچھ خصوصیات گنائی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ ''وہ انھیں (لوگوں کو) ان احساسات سے جو وہ پہلے سے محسوس کررہے ہیں اور زیادہ باخبر کردیتا ہے اور اس طرح انھیں اپنی ذات سے بھی زیادہ باخبر کردیتا ہے وہ اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے روشناس کرادیتا ہے جو اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے تھے''...نسبت کے مطالعے سے بھی ایک باشعور قاری پر یہ منکشف ہوگا کہ اس نے احساس کی دنیا میں اپنی دریافت کی ایک نئی جہت (New Dimention) کو پا لیا ہے یا ایک بلند زینہ طے کرلیا ہے۔

ایک تعریف کی رو سے ''شعر کلام کو کہتے ہیں جو بالقصد موزوں کیا گیا ہو''...نسبت کی شاعری پڑھ کر ایک تمنّا جنم لیتی کہ کاش شاعر بالقصد شعر کہنے کی طرف مائل ہوتا! ایسا کرنے سے وہ شاعری کی دنیا میں اس سے کہیں زیادہ معروف ہوتا جتنا معروف اپنی مختلف الجہات ادبی خدمات کے حوالے سے آج ہے...

بہر حال وجدان اب بھی اس شاعری پر دوام کے روزن، مقبولیت کے دریچے اور ادبی سطح پر پذیرائی کے در کھلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔

پروفیسر محمد اکرم رضا

میں خود تو کچھ نہیں میری نسبت ہے آپ ﷺ سے

حضور سُلطان دوعالم ﷺ کی مدحت و توصیف کا چمن ہمیشہ سے خزاں سے ناآشنا رہا ہے۔ اس گل زار سدا بہار کو عشاقِ حضور ﷺ صدیوں سے اپنے آنسوؤں کا نم پیش کرتے رہے ہیں۔ آنسوؤں کا یہی غم مدحت و توصیف حضور ﷺ کے مہکتے ہوئے گل ولالہ میں اپنی عقیدت آفرینی دکھاتا ہوا نظر آتا ہے۔ عشقِ مصطفٰی علیہ التحیۃ والثنا میں پلکوں پر لرزنے والے آنسو خلاّق مصطفٰی کا خصوصی کرم ہیں۔ یہ کرم الٰہی خوش بخت قلم کاروں کا اعزاز بنتا ہے۔ جنھیں سرورِ کونین ﷺ کی عنبرفشاں یادوں سے اپنے قلب و جان کے خلوت کدوں کو آباد کرنے کا ہنر آتا ہے۔ اس گلستان صدرنگ پر ایک نظر ڈالتے ہی اصحاب ایمان کے افکار مہکنے اور آنکھوں سے عقیدت کے آبگینے ٹپکنے لگتے ہیں۔ اس گلشن کی بہار سامانی جہاں رب کونین کا لطف خاص کیے ہوں وہ سعید قسمت مدحت نگار بھی وقت کے افق پر اپنی جگمگاہٹ کا احساس دلاتے نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنی فکر و بصیرت کی بہترین توانائیاں عشقِ رسول ﷺ کی نذر کردی ہیں۔ ممتاز شاعر اور محقق سیّد محمد ابوالخیر کشفی بھی اسی بلند بخت قافلے کے رُکن ہیں۔

سیّد محمد ابوالخیر کشفی سے ذاتی تعارف نہیں۔ مگر نعت مصطفٰی ﷺ وہ وسیلۂ خاص ہے جو زمان و مکان سے ماورئی ہوکر مداح وممداح کو پل بھر میں قریب سے قریب تر کردیتا ہے۔ ان کی نعت نگاری مدت سے رسائل جو جرائد کے ذریعہ سے قارئین کے فکر و نظر کی زینت بن رہی ہے۔ بکھری ہوئی شعری نگارشات اپنی جگہ اس وقت ان کا نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' مرے پیشِ نظر ہے جو ضخامت میں مختصر ہونے کے باوجود اپنی معنویت فکری جامعیت اور محبتِ

حضورﷺ کی فراوانی کی بدولت اپنے بھرپور اور ہمہ پہلو وجود کا احساس دلاتا ہے۔

اس مجموعہ نعت کا نام ہی بذات خود نعت کی روحانی معنویت کا شعور بخش رہا ہے۔ بارگاہِ رسولﷺ کے حضور نعت پیش کرنے والے اصحاب نعت سے لے کر عصرِ حاضر کے نعت گو شعرا تک سب کی مدحت نگاری کا مقصد و مدعا یہی ہے کہ انھیں آقا مولاﷺ سے نسبت عطا ہوجائے۔ وہ نسبت جو ذرّوں کو آفتاب کی چمک اور قطروں کو سمندروں کی گہرائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو غلاموں کو آقا اور عرب کے بادیہ نشینوں کو شانِ دارائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو حدود و قیود سے ماوریٰ اور زمان و مکان کے تصورات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ وہ نسبت جو چودہ صدیوں کے فاصلوں کو پھلانگ کر دامان سرورِ دوعالمﷺ سے وابستگی کا اعزاز حاصل کرنے میں کام یاب رہتی ہے۔ یہی نسبت سیّدمحمد ابوالخیر کشفی کی شاعری کا افتخار نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

عاصی ہوں مگر ان کی شفاعت پہ نظر ہے
اس نام سے وابستہ ہوں نسبت پہ نظر ہے
طیبہ سے بہت دُور ہوں اور ذوقِ حضوری
اس صاحب معراج کی نسبت پہ نظر ہے

☆

دیکھو تو ذرا نسبتِ سُلطانِ مدینہ
طیبہ میں ملی جنتِ سُلطانِ مدینہ
یہ جان ہے سرکار کی حرمت پہ تصدیق
ایمان مرا حرمت سُلطانِ مدینہ

سیّدابوالخیر کشفی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ جس ہستی عظیم سے نسبت کا اعزاز رکھتے ہیں وہ کس قدر عظیم اور سربلند ہیں۔ وہ عظمتِ حضورﷺ کا تصور کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی خستہ سامانی پر بھی نظر ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک محبّ سُلطان مدینہ کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا محبوب، محبوبِ کائنات ہے۔ ان کا محبوب بلاشبہ محبوب شش جہات ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آقا مولیٰﷺ کی لافانی رفعتوں کا ادراک کرتے

حضور ﷺ کی فراوانی کی بدولت اپنے بھرپور اور ہمہ پہلو وجود کا احساس دلاتا ہے۔

اس مجموعہ نعت کا نام ہی بذاتِ خود نعت کی روحانی معنویت کا شعور بخش رہا ہے۔ بارگاہِ رسول ﷺ کے حضور نعت پیش کرنے والے اصحابِ نعت سے لے کر عصرِ حاضر کے نعت گو شعرا تک سب کی مدحت نگاری کا مقصد و مدعا یہی ہے کہ انھیں آقا مولا ﷺ سے نسبت عطا ہوجائے۔ وہ نسبت جو ذرّوں کو آفتاب کی چمک اور قطروں کو سمندروں کی گہرائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو غلاموں کو آقا اور عرب کے بادیہ نشینوں کو شانِ دارائی عطا کرتی ہے۔ وہ نسبت جو حدود و قیود سے ماورئ اور زمان و مکان کے تصورات سے بے نیاز ہوتی ہے۔ وہ نسبت جو چودہ صدیوں کے فاصلوں کو پھلانگ کر دامان سرورِ دوعالم ﷺ سے وابستگی کا اعزاز حاصل کرنے میں کام یاب رہتی ہے۔ یہی نسبت سیّد محمد ابوالخیر کشفی کی شاعری کا افتخار نظر آتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

عاصی ہوں مگر ان کی شفاعت پہ نظر ہے
اس نام سے وابستہ ہوں نسبت پہ نظر ہے
طیبہ سے بہت دُور ہوں اور ذوقِ حضوری
اس صاحب معراج کی نسبت پہ نظر ہے

☆

دیکھو تو ذرا نسبتِ سُلطانِ مدینہ
طیبہ میں ملی جنتِ سُلطانِ مدینہ
یہ جان ہے سرکار کی حرمت پہ تصدیق
ایمان مرا حرمت سُلطانِ مدینہ

سیّدابوالخیر کشفی اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ وہ جس ہستیٔ عظیم سے نسبت کا اعزاز رکھتے ہیں وہ کس قدر عظیم اور سربلند ہیں۔ وہ عظمتِ حضور ﷺ کا تصور کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی خستہ سامانی پر بھی نظر ہے۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان اور ایک محبّ سُلطان مدینہ کی حیثیت سے وہ سمجھتے ہیں کہ ان کا محبوب، محبوبِ کائنات ہے۔ ان کا محبوب بلاشبہ محبوب شش جہات ہے۔ ایک طرف وہ اپنے آقا مولیٰ ﷺ کی لافانی رفعتوں کا ادراک کرتے ہیں تو دوسری طرف انھیں یہ بھی احساس ہے کہ وہ اس آفتابِ حرا ﷺ کی ابدی طلعتوں کے مقابل ایک ذرّۂ ناچیز ہیں۔ مگر ان کے لیے یہی اعزاز کیا کم ہے کہ انھیں نسبت کا شرف تو حاصل ہے۔ اسی نسبت خاصے حوالے سے ان کے باطن میں آرزوئیں مچلتی ہیں، تمنّائیں اُبھرتی ہیں تصورات کی جلوہ سامانیاں اپنا وجود منواتی ہیں اور کیف و انبساط کی اپنی ساعتوں میں ان کا قلم یوں جواہر لٹانے لگتا ہے:

وہ ایک نام جو آبِ حیات ہے لوگو ۔۔۔ مرے لہو میں مری آرزو میں زندہ ہے
دیارِ شرق سے لے کر دریا مغرب تک ۔۔۔ یہ مشت خاک تری جستجو میں زندہ ہے
تمھاری یاد ہے جس کے لیے مثالِ حرا
وہ کس وقار سے اس ہاؤ ہو میں زندہ ہے

''ایک دعا...ایک نعت'' کے عنوان سے ان کی آرزوؤں کی بلند پروازی ملاحظہ ہو۔ یہ ایسی آرزو ہے جو دُعا کی صورت میں ان کے لبوں سے اُبھرتی اور ان کے قلم سے عقیدت کا خراج لیتی ہے۔

وہ بصیرت اے خدا منزل نما ہم کو ملے ۔۔۔ خاکِ طیبہ میں کسی کا نقشِ پا ہم کو ملے
رحمۃ للعالمیں کے نُور سے رخشندہ ہو ۔۔۔ ایسا اندازِ نظر سب سے جدا ہم کو ملے
ہم قیامت کی تپش میں مسکرا کر اٹھیں اگر ۔۔۔ سرورِ دنیا و دیں کا آسرا ہم کو ملے
ہم مدینے کی زمیں میں اس طرح مدفون ہوں ۔۔۔ خاکِ پاکِ مصطفیٰ بس یہ صلہ ہم کو ملے
قربِ احمد کے ہزاروں سلسلے ربِ کریم
ہم پہ جو روشن نہیں وہ مدعا ہم کو ملے

''نسبت'' کے نام سے سیّد ابوالخیر کشفی کا مجموعہ نعت دل کش اور ایمان آفریں نعتوں کی بہار اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایسی بہار ہے جس کی جاودانی حیثیت مسلم ہے۔ ایسی بہار ہے جو ظاہر اور باطن کو یکساں طور پر معنبر کرتی ہے۔ ایسی بہار ہے جس کے احساس سے ہی آرزوؤں کی پژمردہ کلیاں زندگی پانے لگتی ہیں۔ سیّد کشفی نے اس مجموعۂ نعت میں عشق و عقیدت حضور کا چمن کھلا دیا ہے۔ نقد و نظر کے حوالے سے آگے بڑھتے ہوئے ہم ایک نظر سیّد کشفی کے نظریۂ نعت گوئی پر ڈالنا چاہیں گے۔ ''پیش گفتار'' کے عنوان سے کتاب کے

آغاز میں لکھتے ہیں:

''نعت گوئی اپنی جان کی قیمت پر سرورِ دنیا ودیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دُور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان کی خدمت عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شائد حضوری کا یہ لمحہ حرف وصوت کی صورت دنیا میں کبھی مل جائے۔ نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چندل لمحوں کا نام ہے جوقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں۔ نعت گوئی اس انتظار کا نام ہے۔ جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم۔ رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار۔ نعت دل زندہ کے ساتھ بے داری کی ساعت کا نام ہے۔

''نگاہے یا رسول اللہ نگاہے''

ہم نے ''پیش گفتار'' کی تمام سطور ایک مہک بار اور احساس کے ساتھ نقل کردی ہیں۔ یہ نثری نعت کا اس قدر ایمان آفریں شہ پارہ ہے کہ ایک ایک لفظ دامان بصیرت کو سلطانِ دوعالم ﷺ سے نسبت اور ارادت سے تجلی ریز کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور بلاشبہ کتاب نعت کا دیباچہ اور محبتِ رسول ﷺ کے جذبات کا خلاصہ ہیں۔ کیف و وجدان کا نور لٹاتی ہوئی یہ سطور ہم جیسے خستہ سامانوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کررہی ہیں۔ سیّد کشفی نے اس شہ پارہ میں جس طور حسن نعت کی جلوہ کاری لٹائی ہے وہی جلوہ کاری ان کی نعتوں اور ان کے اسلوب کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نعت اسمِ محمد ﷺ کی جلوہ گری اور اس کے ادراک کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو　　چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہوتو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو　　بزم اقوام بھی دنیا میں نہ ہوتم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزم ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور پھر اقبال ہی کا ایک منفرد تاریخ ساز شعر بھی دیکھیے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کردے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کردے

آغاز میں لکھتے ہیں:

''نعت گوئی اپنی جان کی قیمت پر سرورِ دنیا و دیں ﷺ کے جوار میں پہنچنے کا نام ہے ہم اسی سفر میں مصروف ہیں اور منزل بہت دُور ہے۔ نعت گوئی اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ ان کی خدمت عالیہ میں حاضری کا نام ہے۔ شائد حضوری کا یہ لمحہ حرف وصوت کی صورت دنیا میں کبھی مل جائے۔ نعت گوئی مواجہ شریف میں قیام کے ان چندل لمحوں کا نام ہے جووقت گزراں کے تصور کو مٹا دیتے ہیں۔ نعت گوئی اس انتظار کا نام ہے۔ جس کا پورا مفہوم ہمیں نہیں معلوم۔ رحمت اور عطائے بے کراں کا انتظار۔ نعت دل زندہ کے ساتھ بے داری کی ساعت کا نام ہے۔

''نگاہے یا رسول اللہ نگاہے''

ہم نے ''پیش گفتار'' کی تمام سطور ایک مہک بار اور احساس کے ساتھ نقل کر دی ہیں۔ یہ نثری نعت کا اس قدر ایمان آفریں شہ پارہ ہے کہ ایک ایک لفظ دامان بصیرت کو سلطانِ دوعالم ﷺ سے نسبت اور ارادت سے تجلی ریز کرتا محسوس ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سطور بلاشبہ کتاب نعت کا دیباچہ اور محبتِ رسول ﷺ کے جذبات کا خلاصہ ہیں۔ کیف و وجدان کا نور لٹاتی ہوئی یہ سطور ہم جیسے خستہ سامانوں کو آگے بڑھنے کا حوصلہ عطا کر رہی ہیں۔ سیّد کشفی نے اس شہ پارہ میں جس طور حسن نعت کی جلوہ کاری لٹائی ہے وہی جلوہ کاری ان کی نعتوں اور ان کے اسلوب کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نعت اسمِ محمد ﷺ کی جلوہ گری اور اس کے ادراک کا نام ہے۔ علامہ اقبال کے لفظوں میں:

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزم اقوام بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
بزم ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

اور پھر اقبال ہی کا ایک منفرد تاریخ ساز شعر بھی دیکھیے:

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

اسمِ محمد ﷺ کی تابانیوں سے اُجالا کرنے کی تمنا سیّد کشفی کے افکار نعت میں جگمگاتی نظر آتی ہے۔ یہی نام ان کی آرزوؤں کا حاصل اور ان کی تمناؤں کا مرکز ہے۔ یہی نام و نیا و آخرت میں ان کا سہارا اور ان کے لیے لطف و کرم کا نظارا ہے۔ یہی نام عظمت نعت اور شوکت جذبات ہے۔ اسی نام کے وظیفہ سے ان کے جذبے چمکتے اور ان کے خیالات اشعار میں ڈھلتے ہیں۔ یہی نام ان کے لیے وقار آرزو اور انتہائے جستجو ہے۔ اسمِ محمد ﷺ سے ان کے قلم کی جولانیوں کی ایک جھلک پیشِ خدمت ہے:

غم جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی — میں آج اسمِ محمد ﷺ کے سائبان میں ہوں
زماں مکاں پہ تسلط مرے نبی کا ہے — غریب شہر ہوں اور اپنے ہی مکاں میں ہوں

سلام جس کو کریں ہفت آسماں کشفی
اسی کا خون ہو اور اس کے خاندان میں ہوں

☆

مرا وجود محمد ﷺ کے نام سے قائم — چراغِ کعبہ سے روشن ہیں شبِ شجر میرے

جہاں مسافتیں منزل غبار نورِ سحر
خیال و خواب میں بستے ہیں وہ نگر میرے

☆

ہر مطلعِ نور اسی نام سے روشن — خورشید کو خیرات ملی اس کی جبیں سے

ہاں اسمِ محمد ﷺ ہے مرے نطق کی تاثیر
الفاظ کو مفہوم ملا سرورِ دیں ﷺ سے

☆

ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہوگی — نغمۂ مرسل آخر ہی سنائی دے گا

میرا دل اسمِ محمد ﷺ سے سکوں کا مرکز
ذہن بے مایہ بھی اب اس کی دہائی دے گا

☆

ذہن کو اپنے اُجالوں تو ترا نام لکھوں — اپنے لمحوں کو اُجالوں تو ترا نام لکھوں

گنبدِ خضریٰ کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام
اس کی تصویر بنالوں تو ترا نام لکھوں

اک اسمِ محمد ﷺ کے سوا لوح ابد پر   دیوار و در و بام حرم کچھ نہیں لکھتے
ہر سانس عبارت ہے محمد ﷺ کی ثنا سے
روداد شہاں قصۂ جم کچھ نہیں لکھتے

☆

کرب کی رات میں ایک نام سہارا تو بنا   ہر بنِ مُو سے محمد ﷺ کی صدا آتی ہے
مرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہوگا
ایک پیغام لیے بادِ صبا آتی ہے

محبوبِ دوعالم ﷺ سے نسبت کے سبب سے محبّ صادق کو اپنے محبوب کی ہر ادا عزیز تر ہوتی ہے اور یہاں تو وہ محبوب ہے جس کی ہر ادا اس کے خالق کو بھی محبوب ہے اور جس کی اداؤں کے تذکرے قرآنِ کریم کے نورانی متن سے اُبھرتے ہیں۔ عشاق کو اس سرزمین سے پیار ہوتا ہے جہاں ان کا محبوب رہتا ہے۔ وہ گلیاں وہ کوچے عزیز ہوتے ہیں جنھیں محبوب سے نسبت ہوتی ہے۔ ان راہ گزاروں پر پیار آتا ہے جنھیں محبوب کے قدموں کو بوسہ دینے کا شرف عطا ہوتا ہے۔ یہ تو داستان شوق ہے جو بکھرے تو بکھرتی چلی جاتی ہے۔ پھسلے تو پھر رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ سیّد ابوالخیر کشفی بھی ان کی کیفیات روحانی سے آگاہ ہیں۔ اس لیے شہرِ محبوب دوعالم ﷺ کا تذکرہ بطور خاص ان کے قلم سے عقیدت کا نُور بن کر فروزاں ہوتا ہے۔ یہی شہرِ محبوب ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

لا اقسم بھٰذا البلد   ۝ وانت حل بھٰذا البلد   (پارہ۳۰۔ سورۃ البلد)

''قسم ہے کہ مجھے شہرِ محبوب کی جس میں آپ مقیم رہے۔''

اور جب ایک عاشق خستہ جاں سے پوچھا گیا کہ کائنات میں بڑے بڑے عظیم الشان شہر ہیں جو حسین عمارتوں اور دل فریب نظاروں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ تمھیں کون سا شہر عزیز ہے۔ تو اس عاشق نے محبت و وارفتگی کے عالم میں جواب دیا

گنبدِ خضریٰ کے سائے میں وہ صدیوں کا خرام
اس کی تصویر بنالوں تو ترا نام لکھوں

اک اسمِ محمد ﷺ کے سوا لوح ابد پر   دیوار و در و بام حرم کچھ نہیں لکھتے
ہر سانس عبارت ہے محمد ﷺ کی ثنا سے
روداد شہاں قصۂ جم کچھ نہیں لکھتے

☆

کرب کی رات میں ایک نام سہارا تو بنا   ہر بنِ مُو سے محمد ﷺ کی صدا آتی ہے
مرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہوگا
ایک پیغام لیے بادِ صبا آتی ہے

محبوبِ دوعالم ﷺ سے نسبت کے سبب سے محبِّ صادق کو اپنے محبوب کی ہر ادا عزیز تر ہوتی ہے اور یہاں تو وہ محبوب ہے جس کی ہر ادا اس کے خالق کو بھی محبوب ہے اور جس کی اداؤں کے تذکرے قرآنِ کریم کے نورانی متن سے اُبھرتے ہیں۔ عشاق کو اس سرزمین سے پیار ہوتا ہے جہاں ان کا محبوب رہتا ہے۔ وہ گلیاں وہ کوچے عزیز ہوتے ہیں جنھیں محبوب سے نسبت ہوتی ہے۔ ان راہ گزاروں پر پیار آتا ہے جنھیں محبوب کے قدموں کو بوسہ دینے کا شرف عطا ہوتا ہے۔ یہ تو داستان شوق ہے جو بکھرے تو بکھرتی چلی جاتی ہے۔ پھسلے تو پھر رُکنے کا نام نہیں لیتی۔ سیّد ابوالخیر کشفی بھی ان کی کیفیات روحانی سے آگاہ ہیں۔ اس لیے شہرِ محبوب دوعالم ﷺ کا تذکرہ بطور خاص ان کے قلم سے عقیدت کا نُور بن کر فروزاں ہوتا ہے۔ یہی شہرِ محبوب ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

لا اقسم بھٰذا البلد   o وانت حل بھٰذا البلد   (پارہ ۳۰۔ سورۃ البلد)

"قسم ہے کہ مجھے شہرِ محبوب کی جس میں آپ مقیم رہے۔"

اور جب ایک عاشق خستہ جاں سے پوچھا گیا کہ کائنات میں بڑے بڑے عظیم الشان شہر ہیں جو حسین عمارتوں اور دل فریب نظاروں کو اپنے دامن میں سموئے ہوئے ہیں۔ بتاؤ تو سہی کہ تمھیں کون سا شہر عزیز ہے۔ تو اس عاشق نے محبت و وارفتگی کے عالم میں جواب دیا کہ:

آن خنک شہرے کے دروے دل برست

یعنی شہر تو بے شمار ہیں مگر اس شہر کی عظمتوں کا کیا کہنا جس میں میرا محبوب رہتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لے کر تابعین تک اور پھر ان کے روشن ادوار سے لے کر آج تک شہرِ رسول ﷺ عشاق جاں نواز کی نگاہوں کا مرکز اور تمنّاؤں کا محور بنا ہوا ہے۔ سیّدنا امام مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدینہ طیبہ سے محبت بلاشبہ عشق وعقیدت کا روشن ترین باب ہے۔ امام احمد رضا خاں کی نعتیہ شاعری میں مدینہ منورہ کا خوب ذکر ملتا ہے۔

مدینے کے خطے خدا تجھ کو رکھے   غریبوں فقیروں کے ٹھہرانے والے
حرم کی زمیں اور قدم رکھ کے چلنا
ارے سر کا موقع ہے او جانے والے

☆

جان و دل ہوش و خرد سب تو مدینے پہنچے
تم نہیں چلتے رضا سارا تو سامان گیا

دیکھیے ابوالاثر حفیظ جالندھری مدینہ طیبہ کی عظمتوں کو کس طرح خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

کہاں ایسے نصیب اللہ اکبر سنگِ اسود کے
یہاں کے پتھروں نے پاؤں چومے ہیں محمد ﷺ کے

ان مثالوں سے ہمارا مقصود مضمون کو طوالت دینا نہیں۔ بلکہ فقط یہ عرض کرنا ہے کہ شہرِ محبوب کا تذکرہ ہر محبّ کی آرزوؤں کا حاصل ہوتا ہے۔ سیّد ابوالخیر کشفی کے ہاں اسی نسبت مدینہ طیبہ کی جلوہ کاری بڑی وضاحت کے ساتھ ملتی ہے۔ اُنھوں نے شہرِ مدینہ سے محبت وارفتگی کے خوب صورت نظائر پیش کیے ہیں۔ مدینہ طیبہ کی گلیاں اور کوچے، اس کی مساجد اور بازار، اس کے صحرا اور سبزہ زار، اس کی وادیاں اور رہ گزار، سب کی جھلک ان کے کلام میں ملتی ہے۔ خاص طور پر جب یہ گنبدِ خضریٰ کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی کیفیات قلبی دیدنی ہوتی ہیں۔ ملاحظہ کیجیے:

مدینہ شہر نہیں ہے مری تمنّا ہے　　مدینہ ایک اشارہ ہے روشنی کی طرف
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لیے　　مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسنِ کلام

مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

تسکین دل و جاں کی ہر ایک صورت مطلوب　　طیبہ کی ہوا ہے مرے مولا مرے آقا

وہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائر تنہا
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقا

☆

فضا میں ان کے ہونٹوں کی صدا ہے　　مدینے کی سحر ہے اور میں ہوں

حرا سے سبز گنبد تک مسلسل
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

☆

آسماں گنبدِ خضریٰ سے فروتر نکلا　　یہ حقیقت ہے نہیں نظر کا نیرنگ

غیب بھی ان کے کرم سے مری نظروں پہ کھلا
میں نے دیکھی ہے مدینے میں بہشت رنگ

☆

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے　　تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے

افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہہ شاہِ مدینہ مرے آگے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کا شرف رکھنے والے سیّد کشفی مدینہ طیبہ کی فضاؤں میں کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں اس کا اندازہ متذکرہ بالا اشعار سے بخوبی ہو رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ طیبہ تو حضورِ نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے ''یثرب'' تھا۔ وہ یثرب جو بیماریوں کا مرکز اور ظلمتوں کا گہوارا تھا۔ مگر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدمِ مبارک اس سرزمین پر پہنچے تو یہ شہرِ نبی ﷺ یک بیک مدینہ منورہ بن گیا۔ یوں تو خاک حرم کا ہر ذرّہ

مدینہ شہر نہیں ہے مری تمنّا ہے   مدینہ ایک اشارہ ہے روشنی کی طرف
مدینہ ایک کنایہ ہے زندگی کے لیے   مدینہ صوت و صدا کے بغیر حسنِ کلام
مدینہ حسن سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے
تسکین دل و جاں کی ہر ایک صورت مطلوب   طیبہ کی ہوا ہے مرے مولا مرے آقا
وہ گنبدِ خضریٰ کے قریں طائر تنہا
کشفی کی نوا ہے مرے مولا مرے آقا

☆

فضا میں ان کے ہونٹوں کی صدا ہے   مدینے کی سحر ہے اور میں ہوں
حرا سے سبز گنبد تک مسلسل
سفر اندر سفر ہے اور میں ہوں

☆

آسماں گنبدِ خضریٰ سے فروتر نکلا   یہ حقیقت ہے نہیں نظر کا نیرنگ
غیب بھی ان کے کرم سے مری نظروں پہ کھلا
میں نے دیکھی ہے مدینے میں بہشت رنگ

☆

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے   تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے
افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے
ہے خواب گہہ شاہِ مدینہ مرے آگے

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے نسبت کا شرف رکھنے والے سیّد کشفی مدینہ طیبہ کی فضاؤں میں کیا کچھ محسوس کر رہے ہیں اس کا اندازہ متذکرہ بالا اشعار سے بخوبی ہو رہا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ مدینہ طیبہ تو حضورِ نبی کریم ﷺ کی آمد سے پہلے ''یثرب'' تھا۔ وہ یثرب جو بیماریوں کا مرکز اور ظلمتوں کا گہوارا تھا۔ مگر جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قدمِ مبارک اس سرزمین پر پہنچے تو یہ شہرِ نبی ﷺ یک بیک مدینہ منورہ بن گیا۔ یوں تو خاک حرم کا ہر ذرّہ صورت نجمِ ہدایت ہے اور یہاں کے کنکروں پر لعل و جواہر تصدق ہوتے ہیں۔ مگر اس مقام نور کا کیا کہنا کہ جہاں ممدوح دوعالم حیات ظاہری کے تریسٹھ برس گزار کر آرام فرما ہیں۔ یہ مقام سجدہ گاہِ قدسیاں ہے۔ سراسر عرش نشاں ہے باعث رشک باغِ جناں ہے۔ ایک شاعر کے

بہ قول:

نبی کا جس جگہ پر آستاں ہے
زمیں کا اتنا ٹکڑا آسماں ہے

زمین کا یہی ٹکڑا جو گنبدِ خضریٰ ہے۔ مواجہ شریف کی صورت میں عشاق کو دعوت نظارا دے رہا ہے۔ ایسا نظارا جو مؤدب کا قبلہ اور باوضو قلوب کا کعبہ ہے۔ یہی مواجہ شریف ہے جہاں درود و سلام کی ایمان آفریں صدائیں، ہر لحظہ اور ہر آن اُبھرتی ہیں۔ چودہ سو سالوں پر محیط شب و روز کا ایک لمحہ ایسا نہ ہوگا جب درودوں کے گلاب بارگاہِ حضور ﷺ میں نذر نہ کیے گئے ہوں۔ جب سیّد کشفی کے قدم اس مقام سربلند تک پہنچتے ہیں تو جذبات اشکوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ سانس رُک رُک کر چلتا ہے۔ بے زبانی ہی ترجمان شوق بن جاتی ہے۔ اس موقع پر مواجہ شریف میں ایک آواز کے عنوان سے اپنے جذبات کو ایک زمانے کے جذبات میں ڈھال دیتے ہیں۔

دیارِ غرب میں آنکھیں کسی کی اشکِ فشاں
دیارِ پاک میں نغمہ کسی زبان پہ ہے
کسی ضعیف کی بے نُور ہوتی آنکھوں میں
جمال گنبدِ خضریٰ ابھی منور ہے
وہ خوش نصیب ہیں جن کو ترا پیام ملے
''ہزار بار برو صدا ہزار بار بیا''
ستون توبہ پہ ہونٹوں کو رکھ دیا میں نے
خبر ملی کی تمنّائے سیّد والا
مری نجات کا رستہ بھی ہے وسیلہ بھی

ستون توبہ کے ہونٹوں سے یہ صدا آئی

''ہزار بار برو ہزار بار بیا''

یہی مواجہ شریف ان کی تمناؤں کی نظری جنت ہے۔ وہ جنت کہ جس کا ایک ایک نظارا انھیں حیاتِ نو کی بشارت دے رہا ہے۔

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے

افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے

ہے خواب گہ شاہِ مدینہ مرے آگے

ایک محبِّ صادق کی طرح سیّدابوالخیرکشفی کو احساس ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام توحید خداوندی کے انوار کو دلوں میں اُجاگر کرنے کے لیے آئے تھے۔ آپ کی تعلیمات کا ایک ایک حرف شہ پارۂ قدسی ہے۔ آپ کی سیرت وہ مینارہ نور ہے جس سے پھوٹنے والی روشنی ابد تک سفر کرنے والے قافلوں کو انسانیت نوازی کے آداب عطا کرتی رہے گی۔ ربِ کریم نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کو عالم انسانیت کے لیے ہر دور میں وجہ سرفرازی قرار دیا تھا۔ آپ کا کردار قرآنِ مجید کی تفسیر تھا۔ قرآنِ مجید کا حقیقی متن اسوۂ حضورﷺ ہی میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس لیے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والاصفات کو بولتا ہوا قرآن کہا گیا ہے اور اسی ''قرآن ناطق'' نے اپنی تعلیمات سے زمانے کا رخ تبدیل کر دیا۔ بدوؤں کو حکمت نے خزینے اور عرب کے منتشر شتر بانوں کو شوکت سلطانی و جہاں بانی عطا کی۔ آپ کی سیرت اور آپ کے ارشادات وہ صحیفۂ رشد و ہدایت ہیں کہ جس سے بڑھ کر امن و عافیت کو عام کرنے والے کسی منشور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شاعر کے لفظوں میں:

ترے در کے سوا آسودگیٔ دل کہاں ملتی

زمانہ تیرے در پر ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا

سیّدابوالخیرکشفی کے لیے ذکرِ رسولﷺ سیرت و کردار کی انسانی سربلندیوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ سیرت حضور کی لمحہ افشانیوں کو قلب و جان کا اعزاز بناتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟ افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟

ستون توبہ کے ہونٹوں سے یہ صدا آئی

"ہزار بار برو ہزار بار بیا"

یہی مواجہ شریف ان کی تمنّاؤں کی نظری جنت ہے۔ وہ جنت کہ جس کا ایک ایک نظارا انھیں حیاتِ نو کی بشارت دے رہا ہے۔

روشن ہے مرے خواب کی دنیا مرے آگے — تعبیر بنا گنبدِ خضریٰ مرے آگے

افلاک کو جھکتے ہوئے دیکھا ہے نظر نے

ہے خواب گہ شاہِ مدینہ مرے آگے

ایک محبِّ صادق کی طرح سیّدابوالخیر کشفی کو احساس ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام توحید خداوندی کے انوار کو دلوں میں اُجاگر کرنے کے لیے آئے تھے۔ آپ کی تعلیمات کا ایک ایک حرف شہ پارۂ قدسی ہے۔ آپ کی سیرت وہ مینارہ نور ہے جس سے پھوٹنے والی روشنی ابد تک سفر کرنے والے قافلوں کو انسانیت نوازی کے آداب عطا کرتی رہے گی۔ ربِ کریم نے اپنے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اسوۂ حسنہ کو عالم انسانیت کے لیے ہر دور میں وجہ سرفرازی قرار دیا تھا۔ آپ کا کردار قرآنِ مجید کی تفسیر تھا۔ قرآنِ مجید کا حقیقی متن اسوۂ حضورﷺ ہی میں جلوہ گر نظر آتا ہے۔ اس لیے تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات والاصفات کو بولتا ہوا قرآن کہا گیا ہے اور اسی "قرآن ناطق" نے اپنی تعلیمات سے زمانے کا رخ تبدیل کردیا۔ بدوؤں کو حکمت نے خزینے اور عرب کے منتشر شتر بانوں کو شوکت سلطانی و جہاں بانی عطا کی۔ آپ کی سیرت اور آپ کے ارشادات وہ صحیفۂ رشد و ہدایت ہیں کہ جس سے بڑھ کر امن و عافیت کو عام کرنے والے کسی منشور کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ایک شاعر کے لفظوں میں:

ترے در کے سوا آسودگیٔ دل کہاں ملتی

زمانہ تیرے در پر ٹھوکریں کھاتا ہوا آیا

سیّدابوالخیر کشفی کے لیے ذکرِ رسولﷺ سیرت و کردار کی انسانی سربلندیوں کو اُجاگر کرنے کا ذریعہ ہے۔ سیرت حضور کی لمحہ افشانیوں کو قلب و جان کا اعزاز بناتے ہوئے کہتے ہیں:

یہ سلسلۂ صدق و صفا کس سے ملا ہے؟ — افکار کو اندازِ حیا کس سے ملا ہے؟

سرکارِ دوعالم کے سوا کون امیں ہے — اللہ کا پیغامِ ہدیٰ کس سے ملا ہے؟

ہر نقش میں اک شانِ کریمی ہے خدا کی

یہ پردۂ انوار و ضیا کس سے ملا ہے؟

☆

ہر غیب اک شہود تھا جس شخص کے لیے — وہ رحمت تمام، تھا بینائی دے گیا

وحشت کدے میں صاحبِ معراج آدمی — انسانیت کو انجمن آرائی دے گیا

حرف و بیاں میں جس کو سمیٹا نہ جاسکے

وہ شخص کائنات کو گویائی دے گیا

حسن تغزل شاعری کی جان ہے۔ غزل اور نعت میں تغزل کے پیرائے مختلف ہوتے ہیں۔ غزل میں محبوبانِ مجازی کی توصیف میں شاعر کے قلم کا راہوار جہاں تک پہنچنا چاہے پہنچ سکتا ہے مگر نعت میں تو شریعت اور عقیدت کو زادِ سفر بنا کر آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ ابوالخیر کشفی ایک کہنہ مشق نقاد، نثر نگار اور شاعر ہیں وہ نعت میں تغزل کی طہارت فکر کو سمجھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ حسنِ تغزل کی جلوہ کاری مصنوعی جذبات کے اظہار سے نہیں بلکہ کمالِ عقیدت کے اقرار سے ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہ ہے کہ انوار قرآن سے راہ نمائی لے کر محبتِ رسولﷺ کے قلزم نور میں غوطہ زن ہوکر اپنے وجدان کو تجلیات حضورﷺ کی نذر کردے تو پھر قلم کی نوک سے الفاظ کی جگہ گلاب نکھرتے ہیں۔ جذبوں کی ہوک عشق کی کوک بن جاتی ہے۔

"نسبت" کا شاعر فکر وفن کے امتزاج سے ایسی کیفیات سے گزرتا نظر آتا ہے۔

ہر ایک خلوت جاں میں اسی کی محفل ہے — ہر ایک شخص کو اپنا دکھائی دیتا ہے

غبارِ تشنہ لبی میں نگاہِ اُمّت کو — اسی کی ذات کا دریا دکھائی دیتا ہے

جہاں میں ذاتِ محمدﷺ کے سینکڑوں جلوے — نگاہِ شوق کو کیا کیا دکھائی دیتا ہے

☆

خاک در سرکار سے نسبت ہے کچھ ایسی — عنوان مرے دل کے مقالے کے لیے ہے

بے چہرہ سہی عالم اسلام کا امروز پر گنبدِ خضریٰ تو حوالے کے لیے ہے

میں خواب میں سرکار کو دیکھوں گا کسی دن
معراج یہی چاہنے والے کے لیے ہے

سیّدابوالخیر کشفی گنگ جذبوں کو گویائی اور بے جان لفظوں کو مسیحائی دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بجاطور پر سمجھتے ہیں کہ الفاظ اور جذبے بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سرزمین غزل کے مسافر بھی بن سکتے ہیں اور منزل طیبہ کے پرشوق نظاروں کی جانب اپنے رخ بھی موڑ سکتے ہیں۔ بات تو فقط نسبت کی ہے؟ ان جذبوں کا حاصل کون ہے؟ ان تمناؤں کا محور کون ہے؟ ان تخیلات کے بحرِ بے کراں کا ساحل کون ہے؟ بات کس کی ہو رہی ہے؟ اور بلندیوں کی جانب اُڑان کا جذبہ رکھنے والے طائران سدرہ پرواز کی نگاہوں میں کس کی تجلیات بسی ہوئی ہیں؟ ''نسبت'' کا مطالعہ سیّد کشفی کے جذباتِ عقیدت کی رفعتوں کا واضح اعلان ہے۔ وہ رفعتیں جو سرزمین طیبہ کے ذرات رہ گزار کو بوسہ دے کر اپنے وجود سے ناآشنا ہوتی ہیں۔

''نسبت'' کا مطالعہ اور قاری کے افکار کو ذوق و شوق کی لذت، احساسات کو وارفتگی کی عظمت اور سوچ کے دائروں کو قربت مدینہ کی سعادت عطا کرتا ہے۔ مہکتے ہوئے اشعار پڑھنے والوں کے قلوب کو روحانی تسکین سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ نظریاتی شادمانی اور فکری شادکامی کا مسلسل اور بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ قاری ''نسبت'' کے حوالے سے جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے جذبات بھی شہرِ محبوب کی زیارت کے لیے مچلنے لگتے ہیں۔ سیّد کشفی ایجاز و اختصار کا ہُنر بھی جانتے ہیں۔ وسعت پذیر موضوعات کو چند لفظوں میں سمیٹنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ فضائل و شمائل حضور ﷺ سے سیرتِ مصطفیٰ ﷺ تک اور زبان و بیان کی حلاوت اندوزیوں سے نسبت سرورِ کونین ﷺ کے ضوبار اوراک تک اُنھوں نے منور منور اشعار کی کہکشاں سجائی ہے۔ ایسی کہکشاں کہ جس کا ہر ستارہ، ماہ تاب سخن گوئی کی تب و تاب رکھتا ہے۔

بے چہرہ سہی عالم اسلام کا امروز پر گنبدِ خضریٰ تو حوالے کے لیے ہے

میں خواب میں سرکار کو دیکھوں گا کسی دن

معراج یہی چاہنے والے کے لیے ہے

سیّدابوالخیر کشفی گنگ جذبوں کو گویائی اور بے جان لفظوں کو مسیحائی دینے کا ہنر جانتے ہیں۔ وہ بجاطور پر سمجھتے ہیں کہ الفاظ اور جذبے بذاتِ خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہ سرزمین غزل کے مسافر بھی بن سکتے ہیں اور منزل طیبہ کے پرشوق نظاروں کی جانب اپنے رخ بھی موڑ سکتے ہیں۔ بات تو فقط نسبت کی ہے؟ ان جذبوں کا حاصل کون ہے؟ ان تمناؤں کا محور کون ہے؟ ان تخیلات کے بحرِ بے کراں کا ساحل کون ہے؟ بات کس کی ہو رہی ہے؟ اور بلندیوں کی جانب اُڑان کا جذبہ رکھنے والے طائران سدرہ پرواز کی نگاہوں میں کس کی تجلیات بسی ہوئی ہیں؟ ''نسبت'' کا مطالعہ سیّد کشفی کے جذباتِ عقیدت کی رفعتوں کا واضح اعلان ہے۔ وہ رفعتیں جو سرزمین طیبہ کے ذرات رہ گزار کو بوسہ دے کر اپنے وجود سے ناآشنا ہوتی ہیں۔

''نسبت'' کا مطالعہ اور قاری کے افکار کو ذوق وشوق کی لذت، احساسات کو وارفتگی کی عظمت اور سوچ کے دائروں کو قربت مدینہ کی سعادت عطا کرتا ہے۔ مہکتے ہوئے اشعار پڑھنے والوں کے قلوب کو روحانی تسکین سے بہرہ ور کرتے ہیں۔ نظریاتی شادمانی اور فکری شادکامی کا مسلسل اور بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ قاری ''نسبت'' کے حوالے سے جوں جوں آگے بڑھتا ہے اس کے جذبات بھی شہرِ محبوب کی زیارت کے لیے مچلنے لگتے ہیں۔ سیّد کشفی ایجاز واختصار کا ہُنر بھی جانتے ہیں۔ وسعت پذیر موضوعات کو چند لفظوں میں سمیٹنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ فضائل و شمائل حضور ﷺ سے سیرتِ مصطفیٰ ﷺ تک اور زبان و بیان کی حلاوت اندوزیوں سے نسبت سرورِ کونین ﷺ کے ضوبار اوراک تک اُنھوں نے منور منور اشعار کی کہکشاں سجائی ہے۔ ایسی کہکشاں کہ جس کا ہر ستارہ، ماہ تاب سخن گوئی کی تب و تاب رکھتا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی
نعت کے جگنوؤں کے تعاقب میں

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی کی وفات پر ہر صاحبِ علم وفن ملول ہے کہ اس دورِ بے توفیق میں ایسے صاحبِ علم وعمل کا اُٹھ جانا ایسے خلا کا باعث ہے جس کے پُر ہونے کی اُمید کم کم ہے۔ کشفی مرحوم نے ایسے ماحول میں آنکھ کھولی تھی جہاں ہر فرد دین کی برکات اور حبِ رسول ﷺ کی حسنات سے مالامال تھا، زنان خانہ ہو یا مردانہ، ہر جانب سے ایک مہکار اُٹھتی تھی جو تربیت کی کفیل بھی تھی اور تطہیرِاذھان کی ضامن بھی، نوعمری کے یہ نقوش کشفی مرحوم کی یادوں کا سرمایہ بھی تھے اور نئی نسل کے لیے نصیحت آفروزی کے حوالے بھی، علمی ماحول جس پر آدابِ نبوی کا پُرنور سایہ تھا شخصیت کو سنوارتا بھی رہا اور انفاس کو مہکاتا بھی رہا۔ ایک استاد، ایک محقق، ایک ناقد اور سب سے بڑھ کر ایک مردِ مومن، جس حوالے سے بھی کتابِ زیست کا ورق الٹیے ایک احساسِ عظمت استقبال کرتا ہے۔ ''نعت رنگ'' تو کشفی صاحب کی عنایتوں کا مرقع رہا، ہر شمارے میں کچھ نہ کچھ لکھا اور اس شان سے لکھا کہ دلوں پر دستک دیتا رہا، سماجی نسبتوں سے جو تحریر بھی سامنے آئی یہی پکارتی رہی:

دوڑ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

ادبی موضوعات میں شگفتگی اور جذابیت نے ہر قاری کو متاثر کیا۔ دین کا حوالہ اگرچہ کشفی صاحب کی پہچان نہ تھا مگر ان کی گفتار، تحریر حتکہ روّیوں سے ایسی وارفتگی ظاہر ہوتی رہی جو ماحول کو فریفتہ بناتی رہی، سنِ شعور تک آتے آتے گھر کی پاکدامن حُرمات نے اپنا اثر دکھا دیا تھا، میلادِ اکبر کی پُرکیف فضا، مولانا حقیؔ کہ کی نعتوں کا مبہوت کردینے والا سماں اور مولانا احمد رضا بریلوی کے والہانہ سلام کا منظر، قلب ونظر میں یوں بس گیا تھا کہ مادیت کا کوئی ریلا بھی اس میں ارتعاش پیدا نہ کرسکا، مسلکی تنگ ناؤں سے بے نیاز کشفی مرحوم صرف ایک وابستگی کے ساتھ زندہ رہے اور وہ وابستگی اپنے آقا ومولا ﷺ سے ہی عبارت تھی، خود

اعتراف کیا:

وقت کے جبر سے بالا ہوں رسول اکرمؐ
میری ہر شام وسحر آپ سے وابستہ ہے
یہ زرومال، جہاں میرا حوالہ ہی نہیں
میرا اندازِنظر آپ سے وابستہ ہے
آپ نے اتنا دیا خواہشِ دنیا نہ رہی
بے نیازی کا ہنر آپ سے وابستہ ہے
اپنے کشفی پہ نظر سیّد و آقائے جہاں
ان دعاؤں کا اثر آپ سے وابستہ ہے

کشفی مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں پر محققین آنے والے سالوں میں بہت کچھ لکھیں گے، میں آپ کے عظیم علمی سرمایے سے کئی تحقیقی مقالوں کو سیراب ہوتے محسوس کر رہا ہوں۔ ادبی حوالہ لائقِ توجہ ہے تو تنقیدی شعور دعوتِ فکر دے رہا ہے، فنی محاسن جاذبِ نظر ہیں تو دینی ادب کی سرافرازی کا ایقان بھی لَو دے رہا ہے، نعت ان کا ذوق بھی ہے اور وجہِ قرار بھی، ان کے بقول ''نعت ایک تجلّی مسلسل ہے'' اس لیے یہ تمنا ان کے وجدان کا حصہ ہے کہ مسلسل نعت کہی جائے اور ہمہ وقت سُنی جائے تاکہ لمحاتِ زندگی اس کی تجلیات میں بسر ہوتے رہیں، کشفی صاحب کی کہی ہوئی نعتوں میں شعوری انقیاد بھی ہے اور وجدانی خودرفتگی بھی، کس یقین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں:

امکان مرے تیری نبوت کا ثمر ہیں
تو مطلعِ امکانِ بشر سیّد عالم
اک اسمِ محمدؐ کے سوا لوحِ ابد پر
دیوار و در و بامِ حرم کچھ نہیں لکھتے
ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہوگی
نغمۂ مُرسل آخر ہی سنائی دے گا

اللہ تعالیٰ کشفی مرحوم کی روح کو سایۂ رحمتِ عالمین ﷺ میں دائمی آسودگی عطا کرے کہ وہ مسلسل اسی کی تلاش میں رہی۔ آمین

اعتراف کیا:

وقت کے جبر سے بالا ہوں رسول اکرمؐ
میری ہر شام وسحر آپ سے وابستہ ہے
یہ زروماں، جہاں میرا حوالہ ہی نہیں
میرا اندازِنظر آپ سے وابستہ ہے
آپ نے اتنا دیا خواہشِ دنیا نہ رہی
بے نیازی کا ہنر آپ سے وابستہ ہے
اپنے کشفی پہ نظر سیّد و آقائے جہاں
ان دعاؤں کا اثر آپ سے وابستہ ہے

کشفی مرحوم کے علمی و ادبی کارناموں پر محققین آنے والے سالوں میں بہت کچھ لکھیں گے، میں آپ کے عظیم علمی سرمایے سے کئی تحقیقی مقالوں کو سیراب ہوتے محسوس کر رہا ہوں۔ ادبی حوالہ لائقِ توجہ ہے تو تنقیدی شعور دعوتِ فکر دے رہا ہے، فنی محاسن جاذبِ نظر ہیں تو دینی ادب کی سرافرازی کا ایقان بھی لَو دے رہا ہے، نعت ان کا ذوق بھی ہے اور وجہِ قرار بھی، ان کے بقول ''نعت ایک تجلّی مسلسل ہے'' اس لیے یہ تمنا ان کے وجدان کا حصہ ہے کہ مسلسل نعت کہی جائے اور ہمہ وقت سُنی جائے تا کہ لمحاتِ زندگی اس کی تجلیات میں بسر ہوتے رہیں، کشفی صاحب کی کہی ہوئی نعتوں میں شعوری انقیاد بھی ہے اور وجدانی خودرفتگی بھی، کس یقین کے ساتھ پکار اٹھتے ہیں:

امکان مرے تیری نبوت کا ثمر ہیں
تو مطلعِ امکانِ بشر سیّد عالم
اک اسمِ محمدؐ کے سوا لوحِ ابد پر
دیوار و در و بامِ حرم کچھ نہیں لکھتے
ہر صدا حشر کے میدان میں پتھر ہوگی
نغمۂ مُرسل آخر ہی سنائی دے گا

اللہ تعالیٰ کشفی مرحوم کی روح کو سایۂ رحمتِ عالمین ﷺ میں دائمی آسودگی عطا کرے کہ وہ مسلسل اسی کی تلاش میں رہی۔ آمین

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

نسبت ایک جائزہ

سیّد ابوالخیر کشفی کی شخصیت اربابِ علم وفضل میں نمایاں حیثیت کی حامل ہے۔ وہ ایک معتبر ناقد، معروف صاحبِ قلم، معارفِ قرآنی کے شناسا اور شمائل نبی کریم ﷺ کے مثالی معتقد تھے۔ ایک ملاقات میں قرآن کریم کے مختلف مباحث پر گفتگو سے اندازہ ہوا کہ قرآنیات آپ کا محبوب مشغلہ ہے۔ اس کے مختلف مصادر و ماخذ پر آپ کی گہری نظر ہے۔ اسی ملاقات میں متعدد مفرداتِ قرآنی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جس سے متبادر تھا کہ غرائب قرآن کے باب میں یہ گہرائی و گیرائی اسی وقت ممکن ہے جب قرآن کریم کے تئیں متانت وسنجیدگی اختیار کی جائے۔ اسی ملاقات میں کشفی صاحب نے یہ بھی انکشاف کیا کہ وہ قرآن کریم کا ترجمہ کرنے کے متمنی ہیں۔ پتا نہیں آپ کی قابل قدر اس خواہش کا کیا ہوا؟ بہرکیف کشفی صاحب ایک ایسے عالم اور ایک ایسے انسان تھے جنھیں کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آیا ترا ہی ذکر زباں پر جہاں گئے
ہم لے کے شہر شہر تری داستاں گئے
(منیب الرحمٰن)

پاکستان میں نعتیہ دراسات کی پزیرائی یقیناً ایک خوش آئند قدم ہے۔ اس حوالے سے مختلف کاوشیں اور بے شمار شخصیات انفرادی حیثیت کی حامل ہیں۔ انھی شخصیات میں کشفی صاحب کو ایک خاص مقام ومرتبہ حاصل ہے۔ ایک تو انھیں سیرتِ طیبہ سے عمیق تعلق ہے۔ اسی کو اپنا معیار ومحور تصور کیا۔ اس کے بغیر دین و دنیا کا تصور بے معنی ہے۔ دونوں کا صحیح ادراک اور حقائق کائنات تک صحیح رسائی ناممکن ہے۔ کیوں کہ سیرت پاک کی تہذیب وتطہیر وحی کے ذریعے ہوئی تھی۔ اس لیے بذریعہ وحی تربیت کی جانے والی شخصیت سے اغماض ناکامی کی ضمانت ہے۔ کشفی صاحب نے اپنے علمی و ادبی سفر میں اسی ذاتِ عالیہ کو اپنا راہنما قرار

دیا کیوں کہ دنیا کے تمام مراحل و منازل میں اسی سے اکتسابِ ہدایت ممکن ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام قیادتیں غیر معتبر اور مہمل ہیں۔ کشفی صاحب کے یہ تمام امتیازات آپ کے نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' سے بتام واضح ہیں۔ اس مجموعے کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انھیں حب رسول سے ایسی والہانہ عقیدت تھی کہ دیگر مطالبات ان کے نزدیک شئ حقیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تمام تمناؤں کا مرکز صرف ذاتِ رسول ﷺ تھی۔ موانع و مسائل کا حل سرورِ کائنات تھے۔ انوار و افکار کا منبع صرف فخر موجودات ﷺ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشعار ان کی زبان پر ڈھلتے گئے:

آمد تری، انوار کا اعلانِ جلی ہے
آفاق میں نو بانگِ سحر سیّد عالمؐ
کشفی کی یہی ایک دعا ایک تمنا
مل جائے، اسے آپ کا در سیّد عالمؐ

کشفی صاحب کے مذکورہ دونوں اشعار سے واضح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے آپ کا ایمانی اور جذباتی تعلق تھا۔ انھیں اس پر کامل یقین تھا کہ دنیا کی تمام نیرنگیاں اور تمام خوبیاں آپؐ کی ذاتِ گرامی سے عبارت تھیں۔ اس کے بغیر جہت راست کا پانا ممکن نہیں۔ دنیا کے تمام فلسفے، مباحث اور انکشافات آپ سے ہٹ کر موہوم و مبہوم، مولانا مودودی کا یہ کہنا ہے کہ مطالعۂ قرآن کے بعد تمام فلاسفہ بونے نظر آنے لگے۔ قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی نورانیت نے کتنوں کی تشنگی کو دُور کیا۔ یہی انقلاب کا اور تفکر و تدبر کا صحیح منہاج ہے، یہاں آکر حدود متبائن مل جاتے ہیں۔ انتساب و افتخار کا تصور معدوم ہوجاتا ہے اور تفاوت کی دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے کشفی صاحب کو یہ کہنا پڑا:

یاں مشرق و مغرب کا تفاوت نہیں کشفیؔ
دامانِ رسالت کی ہوا سب کے لیے ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی اعجاز تھا کہ جب ایک مستشرق نے دنیا کے تمام مصلحین اور مشاہیر کا جائزہ لیا تو اس نے ان میں آپؐ کو اوّلیت و افضلیت کا درجہ دیا۔ مغرب کے محققین کو اس کا پورا علم ہے کہ آپ کی ذاتِ فاضلہ آپ کی بے مثال تعلیمات کا مماثل مستبعد ہے جس کا اظہار سرسیّد نے ''خطباتِ احمدیہ'' میں، علامہ شبلی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں، مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ''خطباتِ مدارس'' میں، مولانا

دنیا کیوں کہ دنیا کے تمام مراحل و منازل میں اسی سے اکتسابِ ہدایت ممکن ہے۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام قیادتیں غیر معتبر اور مہمل ہیں۔ کشفی صاحب کے یہ تمام امتیازات آپ کے نعتیہ مجموعہ ''نسبت'' سے بتمام واضح ہیں۔ اس مجموعے کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ انھیں حب رسول سے ایسی والہانہ عقیدت تھی کہ دیگر مطالبات ان کے نزدیک شئ حقیر کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی تمام تمناؤں کا مرکز صرف ذاتِ رسول ﷺ تھی۔ موانع و مسائل کا حل سرورِ کائنات تھے۔ انوار و افکار کا منبع صرف فخر موجودات ﷺ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشعار ان کی زبان پر ڈھلتے گئے:

آمد تری، انوار کا اعلانِ جلی ہے
آفاق میں نو بانگِ سحر سیّد عالمؐ
کشفی کی یہی ایک دعا ایک تمنا
مل جائے، اسے آپ کا در سیّد عالمؐ

کشفی صاحب کے مذکورہ دونوں اشعار سے واضح ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے آپ کا ایمانی اور جذباتی تعلق تھا۔ انھیں اس پر کامل یقین تھا کہ دنیا کی تمام نیرنگیاں اور تمام خوبیاں آپؐ کی ذاتِ گرامی سے عبارت تھیں۔ اس کے بغیر جہت راست کا پانا ممکن نہیں۔ دنیا کے تمام فلسفے، مباحث اور انکشافات آپ سے ہٹ کر موہوم و مبہوم، مولانا مودودی کا یہ کہنا ہے کہ مطالعۂ قرآن کے بعد تمام فلاسفہ بونے نظر آنے لگے۔ قرآن کی حقانیت اور رسول اللہ ﷺ کی نورانیت نے کتنوں کی تشنگی کو دُور کیا۔ یہی انقلاب کا اور تفکر و تدبر کا صحیح منہاج ہے، یہاں آ کر حدود متبائن مل جاتے ہیں۔ انتساب و افتخار کا تصور معدوم ہوجاتا ہے اور تفاوت کی دیواریں منہدم ہوجاتی ہیں۔ اسی لیے کشفی صاحب کو یہ کہنا پڑا:

یاں مشرق و مغرب کا تفاوت نہیں کشفی
دامانِ رسالت کی ہوا سب کے لیے ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی اعجاز تھا کہ جب ایک مستشرق نے دنیا کے تمام مصلحین اور مشاہیر کا جائزہ لیا تو اس نے ان میں آپؐ کو اوّلیت و افضلیت کا درجہ دیا۔ مغرب کے محققین کو اس کا پورا علم ہے کہ آپ کی ذاتِ فاضلہ آپ کی بے مثال تعلیمات کا مماثل مستبعد ہے جس کا اظہار سرسیّد نے ''خطباتِ احمدیہ'' میں، علامہ شبلی نے ''سیرۃ النبی ﷺ'' میں، مولانا سیّد سلیمان ندوی نے ''خطباتِ مدارس'' میں، مولانا صفی الرحمٰن نے ''الرحیق المختوم'' میں اور خالد مسعود نے ''نبیِ حی'' میں کیا ہے۔ اس احساس کو کشفی صاحب نے یوں منظوم کیا ہے:

دیارِ شرق سے لے کر دیارِ مغرب تک
یہ مشتِ خاک تری جستجو میں زندہ ہے
وہ ایک نام جو آبِ حیات ہے لوگو!
مرے لہو میں مری آرزو میں زندہ ہے
فصیل زیست پہ مثل چراغ روشن ہے
دل و نگاہ میں شعلہ اسی کا روشن ہے
مدینہ راہ تمنا پہ نقشِ آخر ہے
مدینہ فرش کی عظمت کا استعارہ ہے

قرآن کریم اور سیرتِ پاک میں بہ صراحت موجود ہے کہ جس طرح سیرتِ پاک ﷺ کو اپنا لائحۂ عمل بنانا ضروری ہے اسی طرح اس لائحۂ عمل کو عام کرنا بھی لازمی ہے۔ ایک محبّ رسول کو عامل کے ساتھ ساتھ داعی ہونا بھی واجبی ہے۔ اسلام اور آپ کی ذاتِ فاخرہ ایک تحریک ہے جسے پھیلا اور آپؐ کے پیغام کو دوسری اقوام میں عام کرنا ایک صاحب اسلام کی ذمہ داری ہے۔ اس ذمہ داری کا بڑا واضح تصور کشفی صاحب کے یہاں موجود تھا۔ اس کے بغیر رسولِ اکرم ﷺ سے محبت کا دعویٰ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ دعوت الی الخیر اُمت مسلمہ کا تشخص ہے اور یہی اختصاص اسے دیگر اقوام سے ممتاز بناتا ہے۔ اس کی معنویت یہ ہے کہ انسان کو اللہ نے دوسرے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے۔ ابنِ خلدون نے اسے اپنے مقدمہ میں بڑے اچھے انداز میں صراحت کی ہے۔ اسی تصور کو کشفی صاحب نے ایک نظم میں یوں پیش کیا ہے:

قلم کے ساتھ اپنے علم و دانش سے
محمد مصطفیؐ کے نور کو نغموں سے پھیلاؤں
ترے دین مبین کو وسعت عالم میں پھیلاؤں
عمل میرا نشانِ راہ منزل ہو
مرا بچہ رسول اللہ کا نقشِ قدم بن کر

ہماری ناتمامی کو مٹا ڈالے

مذکورہ نظم میں کشفی صاحب کا جذبۂ صادق موج زن ہے۔ ایک طرف انھیں اپنے فریضۂ دعوت کا جہاں احساس ہے، وہیں اس کا بھی شدتِ احساس ہے کہ نقوشِ مقدسہ کی پوری طرح تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ اللہ سے دعا گو ہیں کہ ہماری ناتمام خواہشات کا اتمام ہمارے بیٹوں اور آنے والی نسل سے ہو، احساسِ ناکامی کا یہ انداز کس قدر حسین ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایمانی اضطراب ہے۔ اپنی بحر کی موجوں میں تلاطم کے خواہش مند ہیں۔ اسی کرب و اضطراب کا ایک اظہار کشفی صاحب کے یہاں اس طرح ہے:

کرب کی رات میں اک نام سہارا تو بنا
ہر بن مو سے محمدؐ کی صدا آتی ہے
میرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہوگا
ایک پیغام لیے بادِ صبا آتی ہے
درد کچھ اتنا سوا ہے کہ تسلی کے لیے
آج کی رات مدینے کی ہوا آتی ہے

اس مجموعے میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں دربارِ رسول ﷺ میں کشفی صاحب کشکول بہ کف ہیں۔ اسی کو اپنا مستقر اور اپنی جائے امان قرار دیا۔ یہی اُمیدوں کا مرکز ہے، یہی کشفی صاحب اور تمام ملتِ اسلامیہ کا مرکز و مطاف ہے۔ اپنی تمام الجھنوں کو اسی در پر لے کر حاضر ہوتے ہیں اور کامیاب و کامران ہوکر لوٹتے ہیں۔ اپنے ان جذبات کی عکاسی یوں کی ہے:

کشفی کے لیے نعت ہے تابوتِ سکینہ
سرکارِؐ دوعالم کے سوا کس کا کرم ہے

''تابوتِ سکینہ'' کا تصور وہی پیش کرسکتا ہے کہ جس کی قرآن کریم پر نظر ہو، ''تابوتِ سکینہ'' کی ترکیب سے کشفی صاحب نے اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ نعت گوئی قرارِ جان اور طمانیتِ قلب کا واحد نسخۂ کیمیا ہے۔ اس میں ایسی شفا کامل ہے جو انسان کو تمام نسخوں سے بے نیام کردیتی ہے۔ یہ ایک ایسا در ہے جو دیگر دروں کی جبہ سائی سے انسان کو استغنا کردیتی ہے۔ کشفی صاحب کا یہ خیال جگہ جگہ بامِ عروج پر ہے:

غمِ جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی

ہماری ناتمامی کو مٹا ڈالے

مذکورہ نظم میں کشفی صاحب کا جذبۂ صادق موج زن ہے۔ ایک طرف انھیں اپنے فریضۂ دعوت کا جہاں احساس ہے، وہیں اس کا بھی شدتِ احساس ہے کہ نقوشِ مقدسہ کی پوری طرح تکمیل نہیں ہو پا رہی ہے۔ اللہ سے دعا گو ہیں کہ ہماری ناتمام خواہشات کا اتمام ہمارے بیٹوں اور آنے والی نسل سے ہو، احساسِ ناکامی کا یہ انداز کس قدر حسین ہے بلکہ یوں کہیے کہ ایمانی اضطراب ہے۔ اپنی بحر کی موجوں میں تلاطم کے خواہش مند ہیں۔ اسی کرب و اضطراب کا ایک اظہار کشفی صاحب کے یہاں اس طرح ہے:

کرب کی رات میں اک نام سہارا تو بنا
ہر بن مو سے محمدؐ کی صدا آتی ہے
میرے سرکار نے پھر مجھ کو بلایا ہوگا
ایک پیغام لیے بادِ صبا آتی ہے
درد کچھ اتنا سوا ہے کہ تسلی کے لیے
آج کی رات مدینے کی ہوا آتی ہے

اس مجموعے میں متعدد ایسے مقامات ہیں جہاں دربارِ رسول ﷺ میں کشفی صاحب کشکول بہ کف ہیں۔ اسی کو اپنا مستقر اور اپنی جائے امان قرار دیا۔ یہی اُمیدوں کا مرکز ہے، یہی کشفی صاحب اور تمام ملتِ اسلامیہ کا مرکز و مطاف ہے۔ اپنی تمام الجھنوں کو اسی در پر لے کر حاضر ہوتے ہیں اور کامیاب و کامران ہوکر لوٹتے ہیں۔ اپنے ان جذبات کی عکاسی یوں کی ہے:

کشفی کے لیے نعت ہے تابوتِ سکینہ
سرکارؐ دوعالم کے سوا کس کا کرم ہے

''تابوتِ سکینہ'' کا تصور وہی پیش کرسکتا ہے کہ جس کی قرآن کریم پر نظر ہو، ''تابوتِ سکینہ'' کی ترکیب سے کشفی صاحب نے اپنی اندرونی کیفیت کا اظہار کیا ہے کہ نعت گوئی قرارِ جان اور طمانیتِ قلب کا واحد نسخۂ کیمیا ہے۔ اس میں ایسی شفا کامل ہے جو انسان کو تمام نسخوں سے بے نیام کردیتی ہے۔ یہ ایک ایسا در ہے جو دیگر دروں کی جبہ سائی سے انسان کو استغنا کردیتی ہے۔ کشفی صاحب کا یہ خیال جگہ جگہ بامِ عروج پر ہے:

غمِ جہاں سے یہ کہہ دے مری طرف سے کوئی
میں آج اسمِ محمدؐ کے سائبان میں ہوں
سلام جس کو کریں ہفت آسماں کشفی
اسی کا خون ہوں اور اس کے خاندان میں ہوں
بے چہرہ سہی عالمِ اسلام کا امروز
پر گنبدِ خضریٰ تو حوالے کے لیے ہے
وجودِ حضرتِ انسان کے ارتقا کے لیے
ہوا مدینہ میں ایک تازہ آسماں پیدا

کشفی صاحب کا شرایین میں حبِ رسولؐ رواں دواں ہے۔ وہی سوچ کا مرکز اور وہی سفر کا منتہی و مقصد۔ مدینہ ہر وقت ان کے ذہن پر مستولی، اپنی ہر سانس کو اسی سے وابستہ کرنے کے شیدائی۔ درج ذیل قطعہ سے کشفی صاحب کے دل کی دھڑکنوں کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے:

ابرِ بے آب کے مانند جیے جاتا ہوں
کب مدینے کا سفر میرا مقدر ہوگا
روز جو محفل سرکار میں حاضر ہوتے
کون تاریخ میں اب ان کے برابر ہوگا

''نسبت'' کی شاعری سیرتِ رسول ﷺ سے گہری عقیدت پر دال ہے۔ جدید اور قدیم بکھیڑوں سے قطع نظر یہ اردو نعتیہ شاعری میں ایک اضافہ ہے۔ اس میں ایمانی جذبات کی قنادیل فروزاں ہیں۔ اس سے حبِ رسولؐ کی شعاعیں پھوٹ رہی ہیں، اس میں ایسی عطر بیزیاں ہیں کہ پڑھ کر انسان نہال ہوجائے۔ اسے پڑھ کر ایمان کی تجدید ہوتی ہے۔ ایمانی کم زوریاں دم توڑتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس میں لذتِ شعری اور لذتِ ایمانی دونوں ہیں۔ کیا مندرجہ اشعار پڑھ کر انسان کے اندر ترغیب و تحریک نہیں پیدا ہوتی ہے:

مدینہ شہر نہیں ہے، مری تمنا ہے
مدینہ ایک اشارہ روشنی کی طرف
مدینہ راہِ تمنا پہ نقشِ آخر ہے
مدینہ فرش کی عظمت کا استعارہ ہے

مدینہ حسنِ سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

کشفی صاحب کی یہ نعتیہ شاعری جہاں دنیائے نعت میں ایک انفرادیت کی حامل ہے، وہیں اقلیمِ نعت میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی۔ ''نسبت'' کا لفظ لفظ شاہد ہے کہ انھیں صرف دریائے رسالت سے ہی سروکار ہے۔ دنیا کے تمام دریا مل کر بھی ان کی تشنگی بجھانے سے عاجز و قاصر ہیں۔ اسی کے آبِ زلال سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ کشفی صاحب کے اس دعائیہ انداز کو نقل کر کے دست کش ہونا چاہوں گا:

کبھی اہلِ دول کے سامنے دامن کو پھیلایا
کبھی اپنی ہوس کو پیکرِ شعر و سمن دے کر
متاعِ عمرِ ضائع کی
تری توصیف ہے عمرِ پشیماں کی نئی منزل
تری یادیں مرے داغِ ندامت کو مٹائیں گی
مجھے داغِ معاصی ناگ بن کر ڈستے رہتے ہیں
کہ میں نے دین کی قیمت پہ دنیا کا کیا سودا
مگر رشتہ مرا تجھ سے کبھی ٹوٹا نہ ٹوٹے گا
یہ پیمانِ محبت قوتِ دل ہے
ترا دستِ کرم گلہائے بخشش سے مرے دامن کو بھر دے گا
مری توقیر کا ذریعہ ترے دربار سے نسبت
میں خاکِ خشک ہوں گرمی کا مارا ہوں
ترے لطف و کرم کی بارشِ پیہم
مجھے سرسبزیوں سے آشنا کر دے

مدینہ حسنِ سماعت کو اک پیام بھی ہے
مدینہ خستہ دلوں کے لیے سلام بھی ہے

کشفی صاحب کی یہ نعتیہ شاعری جہاں دنیائے نعت میں ایک انفرادیت کی حامل ہے، وہیں اقلیمِ نعت میں ان کے مقام و مرتبہ کا تعین بھی۔ ''نسبت'' کا لفظ لفظ شاہد ہے کہ انھیں صرف دریائے رسالت سے ہی سروکار ہے۔ دنیا کے تمام دریا مل کر بھی ان کی تشنگی بجھانے سے عاجز و قاصر ہیں۔ اسی کے آبِ زلال سے ان کی زندگی وابستہ ہے۔ کشفی صاحب کے اس دعائیہ انداز کو نقل کر کے دست کش ہونا چاہوں گا:

کبھی اہل دول کے سامنے دامن کو پھیلایا
کبھی اپنی ہوس کو پیکر شعر و سمن دے کر
متاعِ عمر ضائع کی
تری توصیف ہے عمر پشیماں کی نئی منزل
تری یادیں مرے داغ ندامت کو مٹائیں گی
مجھے داغ معاصی ناگ بن کر ڈستے رہتے ہیں
کہ میں نے دین کی قیمت پہ دنیا کا کیا سودا
مگر رشتہ مرا تجھ سے کبھی ٹوٹا نہ ٹوٹے گا
یہ پیمانِ محبت قوتِ دل ہے
ترا دستِ کرم گلہائے بخشش سے مرے دامن کو بھر دے گا
مری توقیر کا ذریعہ ترے دربار سے نسبت
میں خاک خشک ہوں گرمی کا مارا ہوں
ترے لطف و کرم کی بارش پیہم
مجھے سرسبزیوں سے آشنا کر دے

ڈاکٹر شبیر احمد قادری

ایک صاحب الرائے نعت شناس

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کا تخلیقی میدان بہت پھیلا ہوا ہے۔ ''نسبت'' ان کی ذاتِ سرورِ دارین علیہ الصلوٰۃ والتسلیم سے ہے اور اسی نسبتِ اقدس کے ناتے اللہ ربّ العزت نے انھیں بہت نوازا ہے۔ وہ کہیں ''حیاتِ محمدی ﷺ'' کا قرآن حکیم کے تناظر میں جائزہ لیتے ہیں اور کہیں اپنے عہد کے ادب اور ادیب کا تجزیہ کرتے ہیں۔ پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ اردو شاعری کے سیاسی اور تاریخی پس منظر پر لکھتے ہیں ساتھ ہی ساتھ اردو ادب کی تاریخ پر ایک دوسری کتاب کی صورت بھی میں نگاہ دوڑاتے ہیں جسے انھوں نے طائرانہ قرار دیا حالاں کہ وہ بھی غائرانہ مطالعہ ہے۔ وہ خواجہ حسن نظامی، شوکت تھانوی، سرسیّد اور منشی ذکاء اللہ دہلوی کے بارے میں لکھتے ہیں اور ''وہ لوگ بھی غضب تھے'' میں شامل Towering Persontìes کے خاکے بھی زیب قرطاس کرتے ہیں۔ غالب کی چھ غزلوں کا خصوصی جائزہ لیتے اور اندھیرے میں اجالے ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ سرزمینِ حجاز کا سفر کرتے ہیں تو اس کے تاثرات ''وطن سے وطن تک'' میں بیان کرتے ہیں اور جب نعت میں تنقید و تحقیق کی سعادت ملی تو حقیقی نعت شناسی کے ایسے معیارات قائم کیے جس کی خواہش تو کی جاسکتی ہے، من و عن تقلید بہت مشکل ہے تاہم ان کی اس حوالے سے ''نعت رنگ'' (مرتب: صبیح رحمانی) اور بعض دوسرے رسائل میں چھپنے والی تنقیدی آرا نہ صرف پڑھنے والوں بلکہ آئندہ اس سلسلے میں لکھنے والوں کی تکنیکی اور فنی سطح پر رہنمائی کرتے ہیں... اختر سعیدی جب ان سے نعت کو ادبی صنف کے طور پر نظر انداز کرنے کی عمومی روش کے بارے میں تاثرات جاننے کے لیے استفسار کرتے ہیں تو انھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر کہا کہ '' نعت کو ادبی صنف کے طور پر نظر انداز کرنے کی روش ہمارے بیش تر نقادوں کے عام مزاج کی عکاسی کرتی ہے۔ وہ سرسیّد کی ''خطباتِ احمدیہ'' شبلی و سلیمان ندوی کی ''سیرت النبی ﷺ'' اور شبلی کی ''الفاروق'' کو جامعات کے نصاب میں شامل ہونے کے باوجود ادبی کتابوں کے دائرے میں شامل نہ کرنے کا حوالہ دیتے ہیں کہ ''محسن کاکوروی، حالی اور اقبال کی نعتیہ شاعری تو ادب کے طور پر پڑھی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود نا قابلِ التفات ہے۔ دراصل یہ

نقاد دین بیزار لوگ ہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ اسلام کو بھی نظریہ سمجھ لو جب اشترا کی نظریے کے تحت لکھا گیا ادب قابلِ مطالعہ ہے تو اس سے کیوں کر گریز؟ ادبی طور پر جو نعتیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں وہ اشترا کی موضوعات پر لکھے گئے ادب سے بہتر ہیں۔ (جنگ میگزین، کراچی، ۱۴رنومبر ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر کشفی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اب تک انھوں نے جو نعتیہ ادب لکھا ہے وہ ادبی معیار اور مطالبوں کے تحت لکھا ہے۔ (ایضاً)

ڈاکٹر سیّد کشفی عقیدتی احساسات کو بھرپور انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے تنقیدی استخراجات سے زیرِمطالعہ موضوع کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ شخصیت کا اس کی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی سعی خیر کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں یہ مطالعات تجزیاتی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زمانی اور مکانی حوالے کیا ہیں۔ وہ نعتیہ ادب کا مطالعہ اس کے سماجی محرکات کی روشنی میں کرنے کے قائل ہیں۔ وہ نعت نگاری میں سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے نبیوں سے تقابل کو بھی مستحسن خیال نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے تقابل کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ یہ نعت کا موضوع ہے۔ آپ کی نصرت اور حمائت کا میثاق ہر رسول سے لیا گیا ہے۔ ہمارے شعرا معلوم نہیں کہ کیوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فروتر اور کم تر ہونے کو موضوع نعت سمجھتے ہیں۔ آخری اور کامل ترین نبی سے کسی نبی کے تقابل کا سوال ہی کیوں اٹھایا جاتا ہے۔

(''نعت رنگ''، کراچی، شمارہ: ۶، ص ۲۰۔۲۰)

اپنے اس مضمون میں وہ نعت میں غلط طور پر رواج پا جانے والے موضوعات کے رو میں قرآن و حدیث سے حوالے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان کے لیے لکھے گئے اپنے فیچر ''اردو میں نعت کا مستقبل'' میں کشفی صاحب میر تقی میر کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا

اس فیچر میں ایک خوبی مجھے نمایاں طور پر نظر آئی ہے وہ یہ کہ کشفی صاحب نے آواز نمبر ایک اور دو کے ساتھ سامع کی آواز بھی شامل کی ہے۔

ایک راوی کہ بقول: طلوعِ اسلام کے بعد چراغِ مصطفیٰ اور شرار بولہبی کی ستیزہ کاری جاری رہی، صدیاں گزرتی رہیں اور یہ حقیقت روشن تر ہوتی گئی کہ اب ہر دور سرورِ کائنات ﷺ کا دور ہے، زمانے کا حسن انھیں کی ذات ستودہ صفات کا پرتو ہے۔ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی تاریخ کا تسلسل اور انسان کے ارتقا کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں ایسے میں سامع کی آواز آتی ہے جو کہتا ہے کہ ''نعت گو شاعروں نے ہر عہد کے اجالوں میں سرورِ کون و مکاں ﷺ کی ذات اور کلام کا جلوہ دیکھا دکھایا ہے۔ چودہ سو سال کی مدت اس

نقاد دین بیزار لوگ ہیں ان سے میں کہتا ہوں کہ اسلام کو بھی نظریہ سمجھ لو جب اشتراکی نظریے کے تحت لکھا گیا ادب قابلِ مطالعہ ہے تو اس سے کیوں کر گریز؟ ادبی طور پر جو نعتیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں وہ اشتراکی موضوعات پر لکھے گئے ادب سے بہتر ہیں۔ (جنگ میگزین، کراچی، ۱۴؍نومبر ۲۰۰۱ء)

ڈاکٹر کشفی کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ اب تک انھوں نے جو نعتیہ ادب لکھا ہے وہ ادبی معیار اور مطالبوں کے تحت لکھا ہے۔ (ایضاً)

ڈاکٹر سیّد کشفی عقیدتی احساسات کو بھرپور انداز سے پیش کرتے ہیں۔ ان کے تنقیدی استخراجات سے زیرِ مطالعہ موضوع کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ شخصیت کا اس کی تخلیقی و تحقیقی کاوشوں کی روشنی میں مطالعہ کرنے کی سعی خیر کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں یہ مطالعات تجزیاتی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زمانی اور مکانی حوالے کیا ہیں۔ وہ نعتیہ ادب کا مطالعہ اس کے سماجی محرکات کی روشنی میں کرنے کے قائل ہیں۔ وہ نعت نگاری میں سردار الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا دوسرے نبیوں سے تقابل کو بھی مستحسن خیال نہیں کرتے ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے تقابل کی نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ یہ نعت کا موضوع ہے۔ آپ کی نصرت اور حمائت کا میثاق ہر رسول سے لیا گیا ہے۔ ہمارے شعرا معلوم نہیں کہ کیوں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے فروتر اور کم تر ہونے کو موضوع نعت سمجھتے ہیں۔ آخری اور کامل ترین نبی سے کسی نبی کے تقابل کا سوال ہی کیوں اٹھایا جاتا ہے۔
(''نعت رنگ''، کراچی، شمارہ: ۶، ص ۲۰۔۲۰)

اپنے اس مضمون میں وہ نعت میں غلط طور پر رواج پا جانے والے موضوعات کے رو میں قرآن و حدیث سے حوالے پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو پاکستان کے لیے لکھے گئے اپنے فیچر ''اردو میں نعت کا مستقبل'' میں کشفی صاحب میر تقی میر کا یہ شعر درج کرتے ہیں:

جلوہ نہیں ہے نظم میں حسنِ قبول کا
دیواں میں شعر گر نہیں نعتِ رسولؐ کا

اس فیچر میں ایک خوبی مجھے نمایاں طور پر نظر آئی ہے وہ یہ کہ کشفی صاحب نے آواز نمبر ایک اور دو کے ساتھ سامع کی آواز بھی شامل کی ہے۔

ایک راوی کہ بقول: طلوعِ اسلام کے بعد چراغِ مصطفٰی اور شرار بولہبی کی ستیزہ کاری جاری رہی، صدیاں گزرتی رہیں اور یہ حقیقت روشن تر ہوتی گئی کہ اب ہر دور سرورِ کائنات ﷺ کا دور ہے، زمانے کا حسن انھیں کی ذات ستودہ صفات کا پرتو ہے۔ احمد مجتبیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی تاریخ کا تسلسل اور انسان کے ارتقا کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں ایسے میں سامع کی آواز آتی ہے جو کہتا ہے کہ ''نعت گو شاعروں نے ہر عہد کے اجالوں میں سرورِ کون و مکاں ﷺ کی ذات اور کلام کا جلوہ دیکھا دکھایا ہے۔ چودہ سو سال کی مدت اس دعویٰ کی سب سے بڑی دلیل کہ حضور ﷺ کے ثنا خوانوں نے انسان کے مستقبل کو آپؐ کی سیرت کردار اور گفتگو سے وابستہ کیا اور انسانیت کو مایوسی نہیں ہوئی۔
(''نعت رنگ''، کراچی، شمارہ: ۳، ص ۱۲۔۲۱۱)

''نعت رنگ'' کے مذکورہ شمارہ میں گوشہ سیّد محمد ابوالخیر کشفی بھی شامل ہے جس میں انھوں نے دوسری اصناف کے ساتھ ساتھ اردو میں جاپانی صنف سخن ''واکا'' میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اس میں کشفی صاحب کی منفرد عقیدتی، اپج ملاحظہ ہو:

ترا اسمِ گرامی جب میرے ہونٹوں پہ آتا ہے
ندامت مجھ کو ہوتی ہے
لب و رخسار کے نغمے
ابھی تک رقص کرتے ہیں
مرے ہونٹوں کی سرحد پر

(۲)

کبھی بادل کے رنگوں میں
کبھی پھولوں کی نکہت میں
کبھی دل کی فضاؤں میں
کبھی فکر و تامل میں
نقوشِ سرورِ کونین کا جلوہ نظر آیا

اس گوشۂ خاص میں پابند اور آزاد نظمیں، ہائیکو اور یک مصرعی نظم (سخن مختصر) بھی شامل ہے گویا کشفی صاحب نئی اصنافِ سخن کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان میں شعری امکانات بھی تلاش کرتے ہیں اور جدید اور اختراعی طبع کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ جدید اور نئی اصناف کو موضوعِ نعت بنانے والے کشفی صاحب نے عربی شاعری ہشام علی حافظ کی نعت کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ (''نعت رنگ''، کراچی، شمارہ :۳، ص ۸۸۔۲۸۶)

لفظی ترجمہ ہونے کے باوجود انھوں نے قوسین کے اندر کچھ اضافے بھی ضروری خیال کیے ہیں جن سے ان عربی نعتوں کی تفہیم میں مزید آسانی پیدا ہوگئی ہے ایک نعت میں کشفی اپنی نعت پسندی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

ہر سانس عبادت ہے محمدؐ کی ثنا سے
رودادِ شہاں، قصہ جم کچھ نہیں لکھتے

ایسی باتیں وہی شخص کرتا ہے جس کے دل میں عشقِ مصطفٰے کی قندیل روشن ہو۔ وہ ناموس مصطفٰے ﷺ کی

پاسداری کے لیے اپنی نعتوں میں حددرجہ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور دوسروں سے بھی بجا طور پر یہی توقع رکھتے ہیں اور جہاں کہیں کسی کے نعتیہ کلام میں بے احتیاطی اور خامی نظر آتی ہے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ نعت کا تقدس پامال ہونے سے بچانے کے لیے قلم و قرطاس سنبھال لیتے ہیں اور ان لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہیں اس طور کہ اس نعت گو اور دوسرے قارئین کو کشفی کی رائے بے دلیل نہ لگے۔ ڈاکٹر ظہیر صدیقی کا کہنا ہے کہ:

> تخلیق تجربہ میں بھرپور شرکت ایک ایسا نصب العین ہے جس کا حصول ممکن نہیں لیکن عملی اعتبار سے اگر کوشش بامقصد اور مخلصانہ ہو اور ضروری علمی، فکری اور ذوقی وسائل میسر ہوں تو یہ بازآفرینی کا عمل کسی حد تک نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔

(''ادب میں جمالیاتی اقدار: ایک مطالعہ''، ص۹۸)

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر کشفی خود تخلیق کار ہیں اور اعلیٰ علمی، فکری اور ذوقی وسائل سے مالا مال بھی ہیں ایسے قلم کار سے یہ توقع بھلا کیوں کر رکھی جاسکتی ہے کہ اس کا تنقیدی شعور اعلیٰ پائے کا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کے نعت سے لگاؤ کا ایک اور مظہران کا بردہ شریف کا منظوم ترجمہ ہے جو ''نعت رنگ'' کے تیسرے شمارہ (مطبوبہ ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کا کمال یہ ہے کہ کشفی صاحب کی اس ترجمانی کے باوجود اس میں یک گونہ تخلیقی پہلو شامل ہوگیا ہے۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے اس ترجمے کے حوالے سے بجا طور پر لکھا ہے:

> اللہ تعالیٰ نے جنابِ کشفی کو تخلیقی جوہر، فنی بصیرت اور ادبی استعداد کے ساتھ ساتھ قلبِ سلیم کی عظمت سے بھی نواز رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد نظم کے بعض ٹکڑے پابند نظم کی جمالیاتی دلپزیری کو بھی شرما رہے ہیں۔

(''نعت رنگ''، شمارہ:۱۰، اپریل ۲۰۰۰ء، ص۱۵۵)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی خاصانِ محمد ﷺ کے حوالے سے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ...خاصانِ محمد ﷺ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جاتے ہیں کہ حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ہمارے معاشرہ میں اندھیرا بڑھ جائے اور ہمیں یہ موقع نہ مل پائے کہ ہو ان کے جلوؤں کی مدد سے زندگی کی شبِ تاریک سحر کرسکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سرورِ کائنات ﷺ اور وجہِ تخلیقِ کائنات ﷺ کے قدموں کے ذرات کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہیں اور چاندنی رات میں جب پھیلی ہوئی دنیا

پاسداری کے لیے اپنی نعتوں میں حددرجہ احتیاط سے کام لیتے ہیں اور دوسروں سے بھی بجا طور پر یہی توقع رکھتے ہیں اور جہاں کہیں کسی کے نعتیہ کلام میں بے احتیاطی اور خامی نظر آتی ہے تو ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ وہ نعت کا تقدس پامال ہونے سے بچانے کے لیے قلم وقرطاس سنبھال لیتے ہیں اور ان لغزشوں کی نشاندہی کرتے ہیں اس طور کہ اس نعت گو اور دوسرے قارئین کو کشفی کی رائے بے دلیل نہ لگے۔ ڈاکٹر ظہیر صدیقی کا کہنا ہے کہ:

> تخلیق تجربہ میں بھرپور شرکت ایک ایسا نصب العین ہے جس کا حصول ممکن نہیں لیکن عملی اعتبار سے اگر کوشش بامقصد اور مخلصانہ ہو اور ضروری علمی، فکری اور ذوقی وسائل میسر ہوں تو یہ بازآفرینی کا عمل کسی حد تک نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔

(''ادب میں جمالیاتی اقدار: ایک مطالعہ''، ص۹۸)

مقام مسرت ہے کہ ڈاکٹر کشفی خود تخلیق کار ہیں اور اعلیٰ علمی، فکری اور ذوقی وسائل سے مالا مال بھی ہیں ایسے قلم کار سے یہ توقع بھلا کیوں کر رکھی جاسکتی ہے کہ اس کا تنقیدی شعور اعلیٰ پائے کا نہ ہوگا۔

ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کے نعت سے لگاؤ کا ایک اور مظہر ان کا بردہ شریف کا منظوم ترجمہ ہے جو ''نعت رنگ'' کے تیسرے شمارہ (مطبوعہ ۱۹۹۶ء) میں شائع ہوا۔ اس ترجمے کا کمال یہ ہے کہ کشفی صاحب کی اس ترجمانی کے باوجود اس میں یک گونہ تخلیقی پہلو شامل ہوگیا ہے۔ پروفیسر محمد اقبال جاوید نے اس ترجمے کے حوالے سے بجا طور پر لکھا ہے:

> اللہ تعالیٰ نے جنابِ کشفی کو تخلیقی جوہر، فنی بصیرت اور ادبی استعداد کے ساتھ ساتھ قلبِ سلیم کی عظمت سے بھی نواز رکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آزاد نظم کے بعض ٹکڑے پابند نظم کی جمالیاتی دلپزیری کو بھی شرما رہے ہیں۔

(''نعت رنگ''، شمارہ:۱۰، اپریل ۲۰۰۰ء، ص۱۵۵)

ڈاکٹر ابوالخیر کشفی خاصانِ محمد ﷺ کے حوالے سے ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

> ...خاصانِ محمد ﷺ اپنے آپ کو چھپاتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں ایسے لمحات آہی جاتے ہیں کہ حجابات اٹھ جاتے ہیں۔ ایسا نہ ہو تو ہمارے معاشرہ میں اندھیرا بڑھ جائے اور ہمیں یہ موقع نہ مل پائے کہ ہو ان کے جلووں کی مدد سے زندگی کی شبِ تاریک سحر کرسکیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو سرورِ کائنات ﷺ اور وجہِ تخلیقِ کائنات ﷺ کے قدموں کے ذرات کے آئینے میں اپنا سراپا دیکھتے ہیں اور چاندنی رات میں جب پھیلی ہوئی دنیا اپنی سمتوں کا اعلان کرے تو کسی کا دامانِ کرم صحرا کی وسعتوں پر چھا جائے۔ صحرا کی بے کرانی کا اندازہ کیے بغیر بہت سے حقائق کا ادراک ممکن نہیں ہے۔ انھیں وسعتوں میں آدمی کو آسمان اپنے سے قریب نظر آتا ہے۔ زمین کے سینے سے ابھرنے والی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ریت کے ذرّات اس کے نقوشِ قدم کی تابانیوں کا اشارہ بن جاتے ہیں جس نے صحرائے وجود کو گلستاں بنایا...

یہاں کشفی صاحب بڑے پتے کی بات کرتے ہیں جو خود ان کے اپنے روحانی مدارج کی طرف اشارہ کرتی ہیں:

> میں نے چاندنی راتوں میں صحراؤں کی بہار سامانی اور نظرافروزی کو دیکھا اور اس منظر کے آئینے میں اس ذات کے وجود کا احساس قوی تر بن گیا ہے جس کا کرم، ابرِ رحمت بن کر گنگا سے ٹیکس تک برسا ہے۔ جو آج بھی ہر اہلِ ایمان کے دل کی دھڑکن ہے جس کے وجودِ پاک سے ہمیں اور ہماری ذات کو معنویت عطا کرنے والی آرزو آگئی ہے۔

(''نعت رنگ''، کراچی، شمارہ:۱۰، اپریل ۲۰۰۰ء، ص۲۲۴)

اس طویل اقتباس کے آخری حصہ کو دوبارہ پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی کی نعت گوئی اور نعت شناسی محض رسمی نہیں بلکہ ان کے روحانی سفر کا اہم ترین حوالہ ہے۔

ڈاکٹر سیّد ابوالخیر کشفی ان ادیبوں میں سے ہیں جو نعت ہو یا کوئی اور صنف ادب اس کا بغور اور بغائر مطالعہ کرنے کے حوالے سے اچھی شہرت اور معتبر مقام کے حامل ہیں۔ ادب کا یوں بدقت نظر مطالعہ وہ کرتا ہے جو تنقیدی اور فکری عمق کا حامل ہو، محقق ہونا اس پر سونے پر سہاگے کا کام دیتا ہے۔ یہ تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی اذواق ہم آہنگ اور یک رُو ہوجائیں تو پھر بندہ کسی بھی شے کو دیکھتے ہوئے سرسری نہیں گزرتا۔

ڈاکٹر کشفی کو ربِ عطا نے نگاہِ عمیق و دقیق عطا کر رکھی ہے۔ شاعر ہونا بجائے خود ایک کمال ہے مگر شعر شناس اور ادب فہم ہونا بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ ڈاکٹر کشفی کو اللہ کریم نے دونوں ہنر عطا کر رکھے ہیں اہم اور متاثر کن پہلو یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنا ایک نقطۂ نظر رکھتے ہیں وہ طے شدہ راہوں پر چلتے رہنے کے بجائے اپنے لیے نئی راہیں تلاش کرنے کی تگ و دو کرتے دکھائی دیتے ہیں جو بجائے خود ان کے صاحب الرائے اور صائب الرائے ہونے کا مظہرِ دانشیں ہے۔

پروفیسر واصل عثمانی

''نعت اور تنقید نعت'' ایک جائزہ

چند برسوں سے نعت گوئی نے جس تیز رفتاری سے اردو ادب کے اشاعتی افق پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے وہ ایک بہت خوش گوار اور خوش آیند عمل کے ساتھ ساتھ ان تمام اصحاب کے لیے قابلِ مبارک باد بھی ہے جنھوں نے نعتوں کی نشر و اشاعت میں اپنے قیمتی اوقات کا صحیح مصرف تلاش کر کے اپنے لیے دنیا ہی میں سامانِ آخرت مہیا کر لیا ہے۔ ''نعت رنگ'' اور اس کے مدیرِ اعلیٰ جناب صبیح رحمانی کا اس سلسلے میں نام جلی حروف سے لکھا جانا چاہیے جنھوں نے ''اقلیمِ نعت'' کو خون رگِ جاں سے منور کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ قدیم شعرا سے جدید ترین شعرا تک کے کلام کو ''نعت رنگ'' میں بلاتفریق ملک و ملت پیش کرنا صبیح رحمانی کا عظیم کارنامہ ہے۔ صاحبان دید و دانش اور اربابِ علم سے عالمانہ مضامین و مقالات قلم بند کرانا ان کا وہ بے مثل کار خیر ہے جو اس سے قبل اس مستعدی اور لگن سے کبھی انجام نہیں دیا گیا۔ قدیم نعتیں اور ان کا تعارف شائقین کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مگر علمی ادبی اور تحقیقی انداز سے نعتوں پر مضامین اور مقالات کی طباعت اس سے قبل کبھی منصۂ شہود پر اس تواتر اور تسلسل سے نہیں ہوئیں۔ نعت گو شعرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و عقیدت کے پیشِ نظر نعتیں کہتے، پڑھتے، داد و تحسین سمیٹتے، صل اللہ سبحان اللہ اور الحمدللہ کی صداؤں سے اپنا دامن مراد بھر لیتے ہیں۔ صاحبان حیثیت اپنے شعر و غزل کے دوا دین کے ابتدائی اوراق میں بطور تبرک چند نعتیں طبع کرا دیتے ہیں مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ جذبہ روز بروز ترقی کرنے لگا اور یہ روش زیادہ شدّومد سے منظر عام پر رونما ہونے لگی۔ اس عہد کا ہر قابلِ ذکر شاعر اپنا ایک نعتیہ مجموعہ شائع کرنا شعری فرائض میں سے تصور کرنے لگا۔

پروفیسر واصل عثمانی

''نعت اور تنقید نعت'' ایک جائزہ

چند برسوں سے نعت گوئی نے جس تیز رفتاری سے اردو ادب کے اشاعتی افق پر اپنا تسلط قائم کر رکھا ہے وہ ایک بہت خوش گوار اور خوش آیند عمل کے ساتھ ساتھ ان تمام اصحاب کے لیے قابلِ مبارک باد بھی ہے جنھوں نے نعتوں کی نشر و اشاعت میں اپنے قیمتی اوقات کا صحیح مصرف تلاش کر کے اپنے لیے دنیا ہی میں سامانِ آخرت مہیا کر لیا ہے۔ ''نعت رنگ'' اور اس کے مدیرِ اعلیٰ جناب صبیح رحمانی کا اس سلسلے میں نام جلی حروف سے لکھا جانا چاہیے جنھوں نے ''اقلیمِ نعت'' کو خون رگِ جاں سے منور کرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے۔ قدیم شعرا سے جدید ترین شعرا تک کے کلام کو ''نعت رنگ'' میں بلاتفریق ملک و ملت پیش کرنا صبیح رحمانی کا عظیم کارنامہ ہے۔ صاحبان دید و دانش اور ارباب علم سے عالمانہ مضامین و مقالات قلم بند کرانا ان کا وہ بے مثل کار خیر ہے جو اس سے قبل اس مستعدی اور لگن سے کبھی انجام نہیں دیا گیا۔ قدیم نعتیں اور ان کا تعارف شایقین کے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے پیش کیا جاتا رہا ہے۔ مگر علمی ادبی اور تحقیقی انداز سے نعتوں پر مضامین اور مقالات کی طباعت اس سے قبل کبھی منصۂ شہود پر اس تواتر اور تسلسل سے نہیں ہوئیں۔ نعت گو شعرا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت و عقیدت کے پیش نظر نعتیں کہتے، پڑھتے، داد و تحسین سمیٹتے، صل اللہ سبحان اللہ اور الحمدللہ کی صداؤں سے اپنا دامن مراد بھر لیتے ہیں۔ صاحبان حیثیت اپنے شعر و غزل کے دوا دین کے ابتدائی اوراق میں بطور تبرک چند نعتیں طبع کرا دیتے ہیں مگر بیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ جذبہ روز بروز ترقی کرنے لگا اور یہ روش زیادہ شدّومد سے منظرعام پر رونما ہونے لگی۔ اس عہد کا ہر قابلِ ذکر شاعر اپنا ایک نعتیہ مجموعہ شائع کرنا شعری فرائض میں سے تصور کرنے لگا۔

صبیح رحمانی نے چند بڑے فکرانگیز اور پرمغز مقالے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی سے نعت کے حوالے سے لکھوا کر ''نعت رنگ'' میں شائع کیے۔ جن کی بڑی تحسین و ستائش اہلِ علم نے کی۔ اب ان ہی شائع شدہ مقالات کا ایک مجموعہ طاہرہ کشفی میموریل سوسائٹی کراچی نے کتابی شکل میں شایقین ادب اور مشتاقین نعت کے لیے بعنوان ''نعت اور تنقید نعت'' پیش کیا ہے۔ اس میں ''نعت کے عناصر''، ''نعت کے موضوعات''، ''نعت گنجینۂ معنی کا طلسم''، ''غزل میں نعت کی جلوہ گری''، ''اردو میں نعت کا مستقبل''، ''ہیں مواجہ پہ ہم'' جیسے اہم مقالات شامل ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کشادہ قلب، بیدار مغز، اور وسیع ذہن کے مالک ہیں آپ کی تحریر شگفتہ، انداز بیان پُرکشش اور طریقۂ اظہار جاذبِ توجہ ہوتا ہے آپ ایک موحد، صحیح الفکر ادیب کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان مقالات میں آپ نے اپنی ذہنی اور دل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروے کار لاتے ہوئے دیانت و امانت سے بڑے بلیغ انداز میں خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نعت گوئی اس کے بنیادی اراکین، لوازمات، آداب، حدود، لفظیات اور زبان و بیان پر جس سلاست و روانی سے اپنے قلم سے کام لیا ہے۔ اس پر داد نہ دینی ادبی بخالت سے تعبیر کی جائے گی۔ ہر چند کہ ان مقالات میں چند باتیں مختلف انداز سے دُہرائی گئی ہیں۔ مگر ان میں قندمکرر کا لطف پایا جاتا ہے اور تمام کا تمام تر قیمہ آپس میں یوں مربوط ہے جیسے کسی کپڑے کے تانے بانے جن میں سے ہر ایک اپنی جگہ کپڑے کی خوب صورتی، خوش نمائی اور مضبوطی کا ضامن ہوتا ہے۔ آپ کی تحریر کی شگفتگی اور اس کے بار بار مطالعے سے طبیعت لطف اندوز ہوتی ہے۔ اور روح میں کیف و انبساط کی فضا کا ظہور ہوتا ہے قاری ''نعت اور تنقیدِ نعت کے مطالعے میں ایسا محو ہوجاتا ہے کہ اس کے لیے وقت کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔ ان مقالات کو سرسری طور سے پڑھ کر گزرنا ممکن نہیں ان میں غور و فکر کے ایسے جزیرے ملتے ہیں جہاں فلسفیانہ خیالات اور ادبی نکات کے گل بوٹے اپنی رنگارنگی سے ایک ایسی فضا پیش کرتے ہیں جن کی دل فریبی اور دیدہ زیبی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ استخراج معانی و مطالب میں کسی تصنع کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ البتہ اس تحریری اور عبارتی سفر میں قاری کو قدم سے قدم ملا کر چلنے کا حوصلہ بہت ضروری ہے ورنہ ان مضامین کی گہرائی اور گیرائی کے سفر میں بھٹک جانے کا اندیشہ ہوسکتا ہے۔ کشفی محصور و محدود فضا میں پرواز کے قائل نہیں۔ وہ کھلی فضا میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے کام لینے کے ہنر سے واقف ہیں۔ ان

مقالات کے مطالعے سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ صرف قدیم اور جدید علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ گرد و پیش زمانہ سے بھی باخبر ہیں اور جدید ترین موضوعات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اس بات کی اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس زمانے کے سیاسی و ادبی نعروں تک کا ذکر انھوں نے بڑی چابک دستی سے ان علمی مضامین میں کیا ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین نعت سے متعلق ہیں مگر ان میں علم کلام، تنقید، شاعری، ادب، لسانیات، مذہبیات، فلسفہ تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے علاوہ آداب زندگی، معاشرت، ترجمہ، تفسیر، سیرت وسوانح کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ غزل، گیت، قصیدہ، رباعی، نظم معرا، نثری نظم، سانیٹ انشائیہ اور ہائیکو پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیاہے۔ کہ نعت کس صنفِ سخن میں بطریقِ احسن کی جاسکتی ہے۔ اس کاوش میں انھوں نے بہتوں کے عبادت فن کا قبلہ درست کرنے کی بھی سعیٔ مشکور کی ہے۔ اس طرح ۱۷۴ صفحات کی یہ مختصر سی کتاب کئی ضخیم ادبی اور تنقیدی کتب پر سبقت لے جاتی ہے۔

اس کتاب میں دو مقالے اتنے اہم اور قابل توجہ ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو کے بغیر مجموعی طور پر کتاب کے لغوی محاسن کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ہم پہلے نعت میں غزل کی جلوہ گری کا ایک سرسری سا تذکرہ کرتے ہیں جس میں خصوصاً چار عظیم شعرا کی چند غزلوں میں نعتیہ اشعار کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور ان کی تشریح وتوضیح میں بڑے بین اور مدلل ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ وہ اشعار جنھیں ہم غزل کا شعر سمجھ کر صرف مجازی دنیا میں گشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی بنیاد اور اساس عشقِ رسول ﷺ بتائی گئی۔ اس طرح قاری کی نظر جو اس دنیائے رنگ و بو میں بھٹکتی الجھتی رہتی ہے اور مجازی عشق کی چار دیواری میں ہی گشت کرتی اور عارضی لطف اٹھاتی ہے اس سے حجاب اٹھا کر حقیقت سے آشنا کیا گیا ہے۔ اس مقالہ میں شاعری خصوصاً غزل کی تعریف میں اکابرین کے اقوال بطور حوالہ پیش کیے گئے ہیں اور غزل کے اشعار کو نعت کے شعر ثابت کرنے میں بڑے ٹھوس دلائل بطور حوالہ دیے گئے ہیں۔ اساتذہ کی غزلوں سے ایسے اشعار اخذ کرنا جن کا بنیادی اور اساسی سرمایہ اور روحانی تعلق نعت سے ہے کوئی آسان کام نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل کے بہت سے اشعار کو نعت کا شعر ثابت کرکے برس ہا برس کے فرسودہ خیالات اور ان کے معانی و مطالب کو نیا رخ عطا کیا ہے۔ انھیں عشق مجازی کے تاریک حصار سے نکال کر نعت کی لامحدود منور فضا میں روشناس کرانے کا وہ حسین فریضہ انجام دیا ہے۔ جسے بت شکنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غزل میں نعت گوئی کا

مقالات کے مطالعے سے اس امر کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ صرف قدیم اور جدید علوم تک ہی محدود نہیں بلکہ گرد و پیش زمانہ سے بھی با خبر ہیں اور جدید ترین موضوعات پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ اس بات کی اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ اس زمانے کے سیاسی و ادبی نعروں تک کا ذکر انھوں نے بڑی چابک دستی سے ان علمی مضامین میں کیا ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین نعت سے متعلق ہیں مگر ان میں علم کلام، تنقید، شاعری، ادب، لسانیات، مذہبیات، فلسفہ تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے علاوہ آداب زندگی، معاشرت، ترجمہ، تفسیر، سیرت و سوانح کے قمقمے جگمگا رہے ہیں۔ غزل، گیت، قصیدہ، رباعی، نظم معرا، نثری نظم، سانیٹ انشائیہ اور ہائیکو پر بھی تبصرہ کرتے ہوئے یہ ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ نعت کس صنفِ سخن میں بطریقِ احسن کی جاسکتی ہے۔ اس کاوش میں انھوں نے بہتوں کے عبادت فن کا قبلہ درست کرنے کی بھی سعیٔ مشکور کی ہے۔ اس طرح ۱۷۴ صفحات کی یہ مختصر سی کتاب کئی ضخیم ادبی اور تنقیدی کتب پر سبقت لے جاتی ہے۔

اس کتاب میں دو مقالے اتنے اہم اور قابل توجہ ہیں کہ ان پر تفصیلی گفتگو کے بغیر مجموعی طور پر کتاب کے لغوی محاسن کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا، ہم پہلے نعت میں غزل کی جلوہ گری کا ایک سرسری سا تذکرہ کرتے ہیں جس میں خصوصاً چار عظیم شعرا کی چند غزلوں میں نعتیہ اشعار کا سراغ لگایا گیا ہے۔ اور ان کی تشریح و توضیح میں بڑے بین اور مدلل ثبوت پیش کیے گئے ہیں۔ وہ اشعار جنھیں ہم غزل کا شعر سمجھ کر صرف مجازی دنیا میں گشت کرنے لگتے ہیں۔ ان کی بنیاد اور اساس عشقِ رسول ﷺ بتائی گئی۔ اس طرح قاری کی نظر جو اس دنیائے رنگ و بو میں بھٹکتی الجھتی رہتی ہے اور مجازی عشق کی چار دیواری میں ہی گشت کرتی اور عارضی لطف اٹھاتی ہے اس سے حجاب اٹھا کر حقیقت سے آشنا کیا گیا ہے۔ اس مقالہ میں شاعری خصوصاً غزل کی تعریف میں اکابرین کے اقوال بطور حوالہ پیش کیے گئے ہیں اور غزل کے اشعار کو نعت کے شعر ثابت کرنے میں بڑے ٹھوس دلائل بطور حوالہ دیے گئے ہیں۔ اساتذہ کی غزلوں سے ایسے اشعار اخذ کرنا جن کا بنیادی اور اساسی سرمایہ اور روحانی تعلق نعت سے ہے کوئی آسان کام نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل کے بہت سے اشعار کو نعت کا شعر ثابت کر کے برس ہا برس کے فرسودہ خیالات اور ان کے معانی و مطالب کو نیا رخ عطا کیا ہے۔ انھیں عشق مجازی کے تاریک حصار سے نکال کر نعت کی لامحدود منور فضا میں روشناس کرانے کا وہ حسین فریضہ انجام دیا ہے۔ جسے بت شکنی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ غزل میں نعت گوئی کا

موضوع ہی ہمیں دو اہم نکات پر غور کرنے کے لیے دعوت دیتا ہے۔ اوّل تو غزل کے صحیح معنی و مطالب کا ادراک اور ان کی تفہیم دوسرے ڈاکٹر کشفی کے خیال افروز مضامین کے متعلق ان کی عالمانہ اور بصیرت افروز تحریر کا مطالعہ جس کے ذریعہ انھوں نے اکابر شعرا کی چند غزلوں کے اشعار میں نعتیہ مضامین کا سراغ لگایا ہے۔ جہاں تک غزل کی نشتریت اور دل گداز ہونے کا سوال ہے اس کا ذکر ہر دور میں اپنے اپنے انداز سے بڑی شد و مد سے کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی گہرائی اور گیرائی کا ہر ذی شعور علاوہ محدودے چند کے قائل و معترف رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اس کی وسعت، ہمہ گیری، جاذبیت، دل کشی اور دل فریبی کا بڑے صریح الفاظ میں اعتراف ہی نہیں کیا بلکہ اس کی وکالت بھی بڑے کامیاب انداز میں کی ہے۔ وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ غزل ہی وہ واحد صنف سخن ہے جس میں ایمائیت و اشاریت کے ساتھ کسی خیال کو پیش کرنے کا وصف بدرجۂ اولیٰ موجود ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ غزل کی تفہیم کے لیے نہایت مہذب اور تربیت یافتہ ذہن درکار ہے۔ اچھی غزل ایک اکائی اور وحدت ہوتی ہے۔ اس کے اشعار کی ترتیب میں بھی حسن جاذبیت اور تاثر پایا جاتا ہے اگر ان اشعار کی ترتیب بدل دی جائے تو اس کا وہ حسن و تاثر باقی نہیں رہ جاتا جو اس کا بنیادی وصف ہے۔ یہ اسی وحدت کے عنصر کی وجہ ہے کہ خلوت وجلوت میں بھی غزل کے اشعار ہونٹوں پر رقص کرنے لگتے ہیں غزل ساغر و مینا کے اشعاروں کے سہارے مشاہدہ حق کی گفتگو کا نام ہے۔ یہ بات حقیقت پر مبنی ہے کہ غزل ایک طرز حیات اور ہماری جمالیاتی اور ثقافتی اقدار کا وسیلہ اظہار ہے چوں کہ غزل کی دنیا ایک بے حدود دنیا، پہنائیوں کی دنیا اور اُفق تا اُفق پھیلی ہوئی دنیا ہے۔ اس لیے یہی ایک ایسی صنف سخن ہے جو نعت کے بار امانت کو اُٹھاسکتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کا ذکر اذکار ہماری زندگی کا حصّہ ہے اور ہمارے جذبات کی تہذیب اور ترفع کا وسیلہ غزل ہے اس لیے اس سے بہتر اور موزوں کوئی دوسری صنف سخن نہیں جس میں سرورِ کائنات ﷺ کے شب وروز، خصائل وفضائل کا تذکرہ ہوسکے، الفاظ کے محدود دائرے جب غزل کی ہیئت اختیار کرتے ہیں تو اس میں اپنی جلوہ گری کے درجہ عروج پر نظر آتے ہیں۔ غزل کے اشعار میں پروئے ہوئے الفاظ معنی و مطالب کی عظمت و اہمیت شانہ بشانہ چلتے ہوئے اپنی محدود فضا سے نکل کر لامحدود کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شاعر جو کچھ کہتا ہے بعض اوقات خود اس پر بھی اس کے مکمل معانی منکشف نہیں ہوتے ہر چند اس بیان میں قدرے مبالغہ ضرور ہے مگر اس

حقیقت سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کیوں کہ غالب و اقبال کا کلام اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کے اشعار کے نت نئے معانی و مطالب بیان کیے جارہے ہے ہیں اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے اشعار کی تفہیم کے نئے باب وا ہو رہے ہیں۔ آپ نے اپنی بات کا ثبوت غالب کی مدحیہ غزل کے ان اشعار سے دیا ہے جن میں فرخ آباد کے تجمل حسین خان کی مدح اس طرح کی گئی ہے کہ نطق کو زبان کے بوسہ کی لذت سے ہم کنار ہونا بتا یا گیا اور اس کی معنی کی وسعت کے پیش نظر اسے نعت سے تعبیر کیا گیا ہے اس غزل کا وہ شعر جس میں تعریف و توصیف کے لیے صفحہ قرطاس کی تنگ دامانی کا ذکر ہے اور ممدوح کی تعریف کے لیے نا مکمل و تشنہ ہونے کا باعث قرار دیا گیا ہے نعت کا شعر کہا گیا ہے۔ شاید ہی کسی نے اس سے قبل کبھی یہ سوچا اور تصور کیا ہو کہ ان اشعار کا اشارہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے یہ نکتہ ڈاکٹر صاحب کی عقابی نگاہوں نے دریافت کیا ہے اور اس کے تخلیقی عناصر میں حب نبی ﷺ کا انکشاف کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے اردو شاعری خصوصاً غزل کے چند معتبر غزل گو شعرا کے کلام میں ایسے نعتیہ اشعار کی نشان دہی کی ہے جن پر تحقیقی نگاہ ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حقیقتاً ان اشعار کا جامہ غزل کے مجازی تفہیم کے لیے بڑا نہیں بلکہ بہت بڑا ہے۔ معنی و مطالب کا یہ جامہ ایک ایسی ہی شخصیت کے لیے مناسب و موزوں ہے جو حدِ ادراک سے بھی پرے ہے کیوں کہ یہی ایک ایسی ذاتِ گرامی ہے جس کی تعریف و توصیف جن و بشر کے علاوہ قادر مطلق کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

اردو غزل کے تشکیلی ڈھانچے کو بہ اعتبار سن تین صدیوں میں تقسیم کر کے ہر صدی کے ایک نمائندہ شاعر کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس کی چند غزلوں سے نعتیہ مضامین کے اشعار اخذ کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان اشعار کے معانی اور ان کی تشریح مجاز کے آئینے میں نہ تلاش کی جائیں کیوں کہ ان اشعار کے ہر ایک لفظ میں نعت کے اجزائے ترکیبی پیوست ہیں جن سے اس بات کی شناخت ہوتی ہے کہ ان کا نسبی تعلق نعت سے ہے۔ اٹھارویں صدی سے میر تقی میر انیسویں سے غالب اور بیسویں صدی سے اقبال اور حسرت موہانی کا انتخاب کر کے انکی غزلوں کے وہ اشعار پیش کیے گئے ہیں جو بادی النظر میں عشقِ مجازی کے آئینہ دار ہیں مگر ان کا بنیادی سلسلہ اور نسبی شجرہ نعت سے ملتا ہے۔ میر کے ایسے اشعار:

آنکھ اس سے نہیں اُٹھنے کی صاحب نظروں کی

حقیقت سے انکار کی بھی گنجائش نہیں کیوں کہ غالب و اقبال کا کلام اس کی زندہ مثال ہے۔ ان کے اشعار کے نت نئے معانی و مطالب بیان کیے جارہے ہے ہیں اس سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ ان کے اشعار کی تفہیم کے نئے باب وا ہو رہے ہیں۔ آپ نے اپنی بات کا ثبوت غالب کی مدحیہ غزل کے ان اشعار سے دیا ہے جن میں فرخ آباد کے تجمل حسین خان کی مدح اس طرح کی گئی ہے کہ نطق کو زبان کے بوسہ کی لذت سے

ہم کنار ہونا بتا یا گیا اور اس کی معنی کی وسعت کے پیش نظر اسے نعت سے تعبیر کیا گیا ہے اس غزل کا وہ شعر جس میں تعریف و توصیف کے لیے صفحہ قرطاس کی تنگ دامانی کا ذکر ہے اور ممدوح کی تعریف کے لیے نامکمل و تشنہ ہونے کا باعث قرار دیا گیا ہے نعت کا شعر کہا گیا ہے۔ شاید ہی کسی نے اس سے قبل کبھی یہ سوچا اور تصور کیا ہو کہ ان اشعار کا اشارہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ہے یہ نکتہ ڈاکٹر صاحب کی عقابی نگاہوں نے دریافت کیا ہے اور اس کے تخلیقی عناصر میں حب نبی ﷺ کا انکشاف کیا ہے۔ اسی طرح آپ نے اردو شاعری خصوصاً غزل کے چند معتبر غزل گو شعرا کے کلام میں ایسے نعتیہ اشعار کی نشان دہی کی ہے جن پر تحقیقی نگاہ ڈالنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حقیقتاً ان اشعار کا جامہ غزل کے مجازی تفہیم کے لیے بڑا نہیں بلکہ بہت بڑا ہے۔ معنی و مطالب کا یہ جامہ ایک ایسی ہی شخصیت کے لیے مناسب و موزوں ہے جو حدِ ادراک سے بھی پرے ہے کیوں کہ یہی ایک ایسی ذاتِ گرامی ہے جس کی تعریف و توصیف جن و بشر کے علاوہ قادر مطلق کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔

اردو غزل کے تشکیلی ڈھانچے کو بہ اعتبار سن تین صدیوں میں تقسیم کرکے ہر صدی کے ایک نمائندہ شاعر کا انتخاب کیا گیا ہے اور اس کی چند غزلوں سے نعتیہ مضامین کے اشعار اخذ کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان اشعار کے معانی اور ان کی تشریح مجاز کے آئینے میں نہ تلاش کی جائیں کیوں کہ ان اشعار کے ہر ایک لفظ میں نعت کے اجزاے ترکیبی پیوست ہیں جن سے اس بات کی شناخت ہوتی ہے کہ ان کا نسبی تعلق نعت سے ہے۔ اٹھارویں صدی سے میر تقی میر انیسویں سے غالب اور بیسویں صدی سے اقبال اور حسرت موہانی کا انتخاب کرکے انکی غزلوں کے وہ اشعار پیش کیے گئے ہیں جو بادی النظر میں عشقِ مجازی کے آئینہ دار ہیں مگر ان کا بنیادی سلسلہ اور نسبی شجرہ نعت سے ملتا ہے۔ میر کے ایسے اشعار:

آنکھ اس سے نہیں اُٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اس کے کفِ پا کا
جن مردوں کو آنکھ دیا ہے خدا نے وے
سرمہ کریں ہیں رہ کی تری خاک دھول کا

میں نعتیہ رنگ کی نمود خاک کو سرمہ بنانے سے اور "صاحب نظر" کے اشارتی لفظ سے ہو رہی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کے راستے کو اپنا راستہ بنانا اور اس راستے کی خاک کو اپنے لیے انداز نظر بنانا ہی صاحب نظر ہونے کی دلیل ہے۔ میر کی شاعری میں حضور اکرم ﷺ کا ذکر اس سطح پر ہے جہاں انسانی تخیل۔ زبان و بیان اور اظہار کے فن اور دل و دماغ کی یک جائی اور ہم آہنگی درجہ عروج پر ہے۔ میر کا یہ شعر:

سو رنگ کی جب خوبی پاتے ہو اسی گل میں
پھر اس سے کوئی اس بن کچھ چاہے تو کیا چاہے

پیش کر کے "لفظ" اُسی کا تعین مفہوم اس طرح کیا گیا ہے کہ یہ کوئی ایسا گل مراد اور مجموعہ صفات ہے جس کے بارے میں سننے والوں کو پوری خبر ہے اور ہزار سکوت کے باوجود اس کا نام دل کی ڈھڑکنوں میں موجود ہے اور یہ گل مراد صرف حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے جس کا ذکر و اذکار میر نے اپنی غزلوں میں استعارے کے طور اکثر اشعار میں کیا ہے بس اس کی تفہیم کی ضرورت ہے جو ہر کسی کا مقدر نہیں ہے۔

اس موقع پر یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ کشفی نے اپنے ان منتخب شعرا کے متعلق بڑے یادگاری جملے سپرد قلم کرکے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری، آل احمد سرور اور پروفیسر خورشید الاسلام کی یادتازہ کر دی ہے۔ میر کے لیے انھوں نے فرمایا ہے "میر تقی میر محض ایک شاعر نہیں بلکہ اردو غزل کی خود مختاری کا اعلان ہے" غالب کے متعلق ان کا یہ قول کتنا معتبر ہے کہ "غالب کے نفس گرم کی حدت سے لفظ پگھل کر اپنے معانی روشن اور ظاہر کردیتے ہیں۔ غالب نے اردو غزل کے حدود کی توسیع کی اور غزل کو زندگی کا قد آدم آئینہ بنا دیا" "حسرت بیسویں صدی میں اردو غزل کے فروغ و ارتقا کے اسباب ہیں" "اقبال کی پوری شاعری اور اس کا فلسفہ خودی عشق و عمل تعلق بالرسول سے عبارت ہے اقبال ملت اسلامیہ کے حدی خواں ہیں۔ اقبال کی شاعری اردو نعتیہ شاعری کی معراج ہے جس نے ہماری اجتماعی فکر اور فن کو نئے دھارے اور رجحانات عطا کیے ہیں۔ فیض ہماری شعری روایت کے ترجمان ہونے کے ساتھ ساتھ نئی ہیئت اور غزل کے ایک نئے عہد کا دیباچہ ہیں۔"

کشفی نے الفاظ اور غزل اور اس کے ربط کا مطالعہ سطحی نظر سے نہیں کیا بلکہ اِس کے عمق اور گہرائی میں اتر کر ایسے گوہر آب دار تلاش کر لائے ہیں جہاں عام ناقد کی نظر پہنچنی دشوار ہے۔ آپ نے چند معتبر شعرا کا انتخاب کر کے جہاں ایک ادبی فریضہ انجام دیا ہے وہیں ایک کار خیر میں خشت اول نصب کرنے کا احسن کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔

غالب کے سلسلے میں ان کا یہ قول سند کا درجہ رکھتا ہے کہ ہر چند کہ اردو میں غالب نے کوئی باضابطہ نعت نہیں کہی لیکن ان کی غزلیں سیّد الابرار شہِ دوسرا ﷺ کا ذکر اپنے دامن میں رکھتی ہیں۔ غالب کو خود بھی مسائل تصوف نظم کرنے پر فخر و ناز تھا اپنے بیان کی شہادت میں غالب کی غزلوں سے نعتیہ مضامین کے اشعار پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھیں ہیرا تراشنے کا فن آتا ہے، مثلاً:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب کے نزدیک جنت کی معنویت اسی صورت میں اُبھر کر آسکتی تھی کہ وہ کسی کی جلوہ گاہ ہو غالب نے دعائیہ انداز میں یہ مضمون باندھا ہے یہ ندرتِ اسلوب کی مثال ہے ورنہ انھیں یقین تھا کہ جنت جلوہ گاہِ مصطفوی ﷺ ہونے کی وجہ سے ہی اہلِ ایمان کے لیے جنت ہے یا پھر غالب کا یہ کہنا:

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں گرد نہیں

یا غالب کی غزل کا یہ شعر:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

ان اشعار کے لہجے اور اسلوب ہی سے ذہن نبی اکرم ﷺ کی طرف مبذول و منعطف ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی غزلوں میں بے شمار اشعار اس نوعیت کے ملتے ہیں جنھیں حضور اکرم ﷺ کی مدح اور ثنا کے ثبوت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

سنا دیا گو ش منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باند ھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

کشفی نے الفاظ اور غزل اور اس کے ربط کا مطالعہ سطحی نظر سے نہیں کیا بلکہ اِس کے عمق اور گہرائی میں اتر کر ایسے گوہر آب دار تلاش کر لائے ہیں جہاں عام ناقد کی نظر پہنچنی دشوار ہے۔ آپ نے چند معتبر شعرا کا انتخاب کر کے جہاں ایک ادبی فریضہ انجام دیا ہے وہیں ایک کارِ خیر میں خشت اول نصب کرنے کا احسن کارنامہ بھی انجام دیا ہے۔

غالب کے سلسلے میں ان کا یہ قول سند کا درجہ رکھتا ہے کہ ہر چند کہ اردو میں غالب نے کوئی باضابطہ نعت نہیں کہی لیکن ان کی غزلیں سیّد الابرارشہِ دوسرا ﷺ کا ذکر اپنے دامن میں رکھتی ہیں۔ غالب کو خود بھی مسائل تصوف نظم کرنے پر فخر و ناز تھا اپنے بیان کی شہادت میں غالب کی غزلوں سے نعتیہ مضامین کے اشعار پیش کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انھیں ہیرا تراشنے کا فن آتا ہے، مثلاً:

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالب کے نزدیک جنت کی معنویت اسی صورت میں اُبھر کر آسکتی تھی کہ وہ کسی کی جلوہ گاہ ہو غالب نے دعائیہ انداز میں یہ مضمون باندھا ہے یہ ندرتِ اسلوب کی مثال ہے ورنہ انھیں یقین تھا کہ جنت جلوہ گاہِ مصطفوی ﷺ ہونے کی وجہ سے ہی اہلِ ایمان کے لیے جنت ہے یا پھر غالب کا یہ کہنا:

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں گرد نہیں

یا غالب کی غزل کا یہ شعر:

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لیے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

ان اشعار کے لہجے اور اسلوب ہی سے ذہن نبی اکرم ﷺ کی طرف مبذول و منعطف ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اقبال کی غزلوں میں بے شمار اشعار اس نوعیت کے ملتے ہیں جنھیں حضور اکرم ﷺ کی مدح اور ثنا کے ثبوت کے لیے پیش کیا جاسکتا ہے۔

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

یا پھر ان کی غزل کا وہ شعر جس میں کہا گیا ہے:

شراب کہن پھر پلا ساقیا

یہاں ساقیا سے مراد بجز رسول اکرم ﷺ کے اور کون سی ذات ہوسکتی ہے جس سے یہ استدعا کی جاسکے کہ وہی جام پھر گردش میں آئے جس سے مئے لاالہ نوش کر کے انسان راہِ نجات پا جاتا ہے۔ رومی و غزالی کے فکر میں نقشِ مصطفوی ﷺ سے زندگی کی رمق پانے کا ذکرِ اقبال نے اپنے اشعار میں کیا اس کی تشہیر و توضیح میں ان کی نکتہ سنج طبیعت اور دُور رس نگاہوں نے بڑا فعال کردار ادا کیا ہے۔ اقبال کی پوری شاعری تعلقِ رسول ﷺ کی چمک سے منور ہے اسی لیے غزل کے اکثر اشعار میں ''مولائے یثرب'' سے درخواست ہے۔ اپنی دانش کو ''فرنگی'' اور ایمان کو ''زناری'' کہنے کا حوصلہ صرف اقبال جیسے عاشقِ رسول ﷺ ہی کو ہوسکتا ہے۔ اقبال کو گردوں کو عالم بشریت کے زد میں ہونے کا خیال و اعتراف ''معراجِ مصطفےٰ ﷺ'' سے ہی ملتا ہے۔ ''غبار راہ'' کو ''فروغ وادی سینا'' بخشنے کا نعرہ لگانے والا یہی شاعر اقبال ہے جس نے اپنی غزلوں کے در و بام کو ذکرِ رسول ﷺ سے منور و معطّر کر رکھا ہے۔

بیسویں صدی میں اقبال کے ذکر کے علاوہ حسرت اور فیض کا بھی ذکر بڑے والہانہ اور عقیدہ تمندانہ طریقے سے کیا گیا ہے۔ حسرت کے ذکر میں جس اپنائیت اور قربِ خاص کا احساس پایا جاتا ہے اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ حسرت موہانی کا زیادہ تر قیام کان پور میں تھا اور کشفی کی سکونت بھی کان پور میں ہی تھی جہاں ان کے والد محترم ثاقب کان پوری اور حسرت موہانی وہاں کی ادبی انجمنوں اور مشاعروں میں مرکزی حیثیت رکھتے تھے۔ کشفی نے حسرت کی غزلوں کے علاوہ ان کی زندگی کے شب و روز کا بہت قریب سے مطالعہ کیا تھا۔ حسرت کی شخصیت بطور غزل گو ان کی نگاہ میں بہت معزز و محترم ہے۔ حسرت کو وہ ایک درخشندہ و تابندہ مشعل کا درجہ دیتے ہیں۔ کان پور سے کراچی اور کراچی سے کعبہ تک کے سفر میں انھیں حسرت کے بے شمار اشعار موقع موقع سے یاد آتے اور اپنی قربت کا احساس دلاتے رہتے ہیں ان کی مجاہدانہ اور درویشانہ زندگی کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب ان کی غزلوں پر غور کرتے ہیں تو اکثر اشعار کے پس منظر حبِ نبی ﷺ سے آراستہ نظر آتے ہیں ان کو ''نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے'' یا ''دلوں کو فکر دوعالم سے کردیا آزاد'' اور ''ارباب ہوس کو گنجایش ایمان کرلیں'' میں نعتیہ اشعار کی جلوہ گری محسوس ہوتی ہے۔ بات صرف میر، غالب، اقبال اور حسرت پر ہی ختم نہیں ہوتی بلکہ فیض کی

غزلوں میں بھی کشفی کو نعت کے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ درون بینی شاید ان کو اس وقت نصیب ہوئی جب فیض نے خود اپنی غزل کے نعتیہ اشعار کی طرف اشارہ کیا۔ ''رنگ و خوشبو''، ''نجات دل کا عالم''، ''حسن دست عیسٰی'' میں بھی انھیں نعت کے گل و گلزار کھلکھلاتے محسوس ہوتے ہیں۔ ''حسن و خوبی'' کے استعارے ہوں یا ''دلِ کافر'' کو ان کی رہ گزر میں بندگی کے آداب کا سراغ ملتا ہوا نظر آتا ہے۔

کشفی کو صرف اساتذہ فن کی غزلوں میں ہی نہیں بلکہ انھیں جدید شعرا کی غزلوں سے بھی نعتیہ اشعار اخذ کرنے اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کا سلیقہ اور ہنر بدرجۂ اتم آتا ہے، مثلاً احمد ندیم قاسمی، فضل احمد کریم فضلی، سراج الدین ظفر، شیر افضل جعفری، عرش صدیقی، پیرزادہ قاسم، صہبا اختر، عثمان رمز، رئیس علوی، امتیاز ساغر، جلیل عالی اور سلیم کوثر کی غزلوں کے ان اشعار کے حوالے دیے ہیں جن سے نعتِ رسول ﷺ اور حبِ نبی ﷺ کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور غزل کو تابدار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔

دوسرا مقالہ جس کا عنوان ''نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم'' ہے نہایت مدلل، جامع اور فکر انگیز ہے اس مقالے میں لفظ بیان۔ زبان اور علم کلام جیسے موضوعات پر ایک بڑی عالمانہ اور فاضلانہ بحث ہے جس کی تفہیم کے لیے تحمل و تفکر کے علاوہ ایک سریع الفہم ذہن کی ضرورت ہے ورنہ انسانی زندگی۔ معرفت الٰہی۔ حبِ نبی ﷺ اور انکا روزمرّہ کارحیات سے ربط و تسلسل سمجھنا ناممکن ہوگا۔ الفاظ کی تاثراتی قوت اور ان کا مناسب استعمال محاورات کی نزاکت۔ تشبیہات و استعارات کی اہمیت و افادیت پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مقالا فلسفیانہ خیالات اور منطقی استدلال پر مبنی ادب کا وہ شہ پارہ ہے جو نعتیہ ادب میں ایک نادر مثال کی طرح ہمیشہ حوالے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ ادب کے طالب علم کو عموماً اور نعت گو شعراء کو لازماً اس کا مطالعہ بڑی توجہ سے کرنا چاہیے کیوں کہ اس کتاب کا یہی کلیدی اور مرکزی مقالہ ہے جسے ہر لحاظ سے جامع مکمل اور مدلل کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا اس مقالے کی حیثیت اور نوعیت ایک ایسے صحیفہ کی ہے جس کے ایک حصہ میں فلسفہ، منطق، علمِ کلام فصاحت و بلاغت پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ دوسرے کے حصے میں علمائے حق اور ان کے وہ خیالات رقم کے گئے ہیں جن کا ادب اور دینی موضوعات سے بڑا قریبی رشتہ ہے۔ ان میں شاہ عبدالقادرؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، فتح محمد جالندھریؒ، مولانا مودودیؒ اور سیّد ابوالحسن علی ندویؒ جیسے مستند علمائے دین اور مفسرین کے حوالے مقالے کی اہمیت میں اضافہ کا باعث قرار پاتے ہیں۔ اس مقالے میں ''نقوشِ اقبال مضفۂ'' سیّد ابوالحسن

غزلوں میں بھی کشفی کو نعت کے چراغ جلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ درون بینی شاید ان کو اس وقت نصیب ہوئی جب فیض نے خود اپنی غزل کے نعتیہ اشعار کی طرف اشارہ کیا۔ ''رنگ و خوشبو''، ''نجات دل کا عالم''، ''حسن دست عیسیٰ'' میں بھی انھیں نعت کے گل و گلزار کھلکھلاتے محسوس ہوتے ہیں۔ ''حسن و خوبی'' کے استعارے ہوں یا ''دلِ کافر'' کو ان کی رہ گزر میں بندگی کے آداب کا سراغ ملتا ہوا نظر آتا ہے۔
کشفی کو صرف اساتذہ فن کی غزلوں میں ہی نہیں بلکہ انھیں جدید شعرا کی غزلوں سے بھی نعتیہ اشعار اخذ کرنے اور اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کا سلیقہ اور ہنر بدرجۂ اتم آتا ہے، مثلاً احمد ندیم قاسمی، فضل احمد کریم فضلی، سراج الدین ظفر، شیر افضل جعفری، عرش صدیقی، پیرزادہ قاسم، صہبا اختر، عثمان رمز، رئیس علوی، امتیاز ساغر، جلیل عالی اور سلیم کوثر کی غزلوں کے ان اشعار کے حوالے دیے ہیں جن سے نعتِ رسول ﷺ اور حبِ نبی ﷺ کی کرنیں پہنائے غزل کو تابدار کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتیں۔
دوسرا مقالہ جس کا عنوان ''نعت اور گنجینۂ معنی کا طلسم'' ہے نہایت مدلل، جامع اور فکر انگیز ہے اس مقالے میں لفظ بیان۔ زبان اور علم کلام جیسے موضوعات پر ایک بڑی عالمانہ اور فاضلانہ بحث ہے جس کی تفہیم کے لیے تحمل و تفکر کے علاوہ ایک سریع الفہم ذہن کی ضرورت ہے ورنہ انسانی زندگی۔ معرفت الٰہی۔ حبِ نبی ﷺ اور انکا روزمرّہ کارحیات سے ربط و تسلسل سمجھنا ناممکن ہوگا۔ الفاظ کی تاثراتی قوت اور ان کا مناسب استعمال محاورات کی نزاکت۔ تشبیہات و استعارات کی اہمیت و افادیت پر بڑی سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ مقالا فلسفیانہ خیالات اور منطقی استدلال پر مبنی ادب کا وہ شہ پارہ ہے جو نعتیہ ادب میں ایک نادر مثال کی طرح ہمیشہ حوالے کے طور پر پیش کیا جائے گا۔ ادب کے طالب علم کو عموماً اور نعت گو شعراء کو لازماً اس کا مطالعہ بڑی توجہ سے کرنا چاہیے کیوں کہ اس کتاب کا یہی کلیدی اور مرکزی مقالہ ہے جسے ہر لحاظ سے جامع مکمل اور مدلل کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا اس مقالے کی حیثیت اور نوعیت ایک ایسے صحیفہ کی ہے جس کے ایک حصہ میں فلسفہ، منطق، علمِ کلام فصاحت و بلاغت پر توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ دوسرے کے حصے میں علمائے حق اور ان کے وہ خیالات رقم کے گئے ہیں جن کا ادب اور دینی موضوعات سے بڑا قریبی رشتہ ہے۔ ان میں شاہ عبدالقادرؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، فتح محمد جالندھریؒ، مولانا مودودیؒ اور سیّد ابوالحسن علی ندویؒ جیسے مستند علمائے دین اور مفسرین کے حوالے مقالے کی اہمیت میں اضافہ کا باعث قرار پاتے ہیں۔ اس مقالے میں ''نقوشِ اقبال مضفۂ'' سیّد ابوالحسن علی ندوی، شبلی کی ''شعرالعجم'' اور خود ان کی کتاب، ''وطن سے وطن تک'' کے اقتباسات قاری کے ذوق مطالعہ کو توانائی بخشتے ہیں۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، رباعی، ترجیع بند، مسدس، گیت پر بھی برسبیل تذکرہ مختصر سا تبصرہ نعتیہ فضا کو ہمہ رنگ بنانے کے لیے کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں طالبان علم کو نعت کے آداب۔ خصوصیت اور خاصیت معلوم کرنے اور ذہن نشین کرنے کے بڑے سبق آموز اشارے ملتے ہیں۔ میری رائے میں اس مقالے کے کینوس کا اندازہ لگانا مجھ جیسے کم سواد شخص کے لیے ممکن نہیں۔ اس کے متعلق سامعی علم سے بہتر ہوگا کہ اس مقالے کا بذات خود مطالعہ کر کے پھر کوئی رائے قائم کی جائے کہ یہ انشائیہ ہے یا تنقید ہے۔ ادبی شہ پارہ ہے یا نعت کہنے اور لکھنے کے لیے ایک گائیڈ اور کلید ہے ہم یہاں اس مضمون کا صرف ایک پیراگراف نقل کر کے سکوت اختیار کریں گے کیوں کہ اس تحریر سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ موجودہ عہد کی نعتیں جن میں رومانی لہجہ اختیار کیا گیا کتنا نا مناسب اور ناروا خیال کیا گیا ہے اور ڈاکٹر صاحب کی حق گوئی۔ راست فہمی کی شناخت اور مزاج کا اندازہ ہوسکے گا کہ انھوں نے ایسے شعرا کی کیسی خبر لی ہے۔

> بہت سی نعتوں میں غزل کا مروّجہ لہجہ۔ عام الفاظ اور وہ اسلوب ملتا ہے جس کا رومانی لہجہ اعلیٰ عشقیہ شاعری کی کوئی صفت اپنے دامن میں نہیں رکھتا۔ اس اسلوب کا نامناسب ہونا بین اور واضح ہے اس پر اضافہ کیجیے اس حقیقت کا کہ بہت سے حضرات نے ''سیکولر نعتیں'' کہی ہیں۔ وہ رسول کریم و عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی دوسرے انسانی رہبروں اور'' لیڈروں''میں سے ایک سمجھتے ہیں اور بس نتیجہ ظاہر ہے کہ کیسی نعتیں ایسے لوگوں کے قلم سے سامنے آئیں گی۔
>
> اب بتائیے کہ اپنے موضوع اس کے سیاق و سباق اس کی وسعتوں اور پہلوؤں سے دُور ہو کر شاعری کس حد تک گرسکتی ہے اور الفاظ اپنے معانی سے محروم ہو کر کس طرح خزف ریزے ہو جاتے ہیں ان ٹھیکروں سے تو کوئی آواز بھی نہیں نکلتی۔ نعت کا شعر وہی شعر ہے جس کو پڑھتے ہی سرورِ کون و مکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال مبارک ذہن میں آجائے

اور جو آپ کے مرتبۂ عظیم کے شایان شان ہو۔ ویسے بہت سے شعر خوب
صورت ہونے کے باوجود نعت کے شعر نہیں کہے جاسکتے۔

دوسرے مضامین ''نعت کے عناصر'' اور ''نعت کے موضوعات'' بھی بڑے دلچسپ معلومات افزا اور فکر انگیز ہیں جن میں نعت کے موضوعات اور گھسے پٹے خیالات اور انداز کو بار بار دہرانے والے شعرا کو مخاطب کرکے یہ فرمایا گیا ہے کہ نعت میں مروّجہ الفاظ اور انداز تخاطب اختیار کرنے سے قبل ان کے معانی ومطالب پر بھی غور کرنا چاہیے صرف اندھی تقلید سے نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہوتا اور کوئی خاص تاثر و کیفیت کی نمو نہیں ہوتی۔ ''کالی کملی والے''۔ ''داتا کے بھکاری''، ''خواہش وصل''، ''حلقہ گیسو'' جیسے الفاظ نعت میں استعمال کرنا۔ ناروا اور نامناسب ہیں۔ دوسرے انبیا علیہم السلام اور حضرت جبرئیل کی تحقیر کسی طور سے بھی جائز نہیں۔ نعت کی حدود کو بلاوجہ وسیع کرنے کی کوشش اور موضوعات میں اضافہ کرنے کی بے جا خواہش ایسے ہی مضامین نظم کرنے میں مدد گار ثابت ہوتی ہے جس سے اسلامی نقطۂ نگاہ اور شریعت کے بنیادی اصولوں پر زد پڑتی ہے، مثلاً شافع روز حشر کو اگر مالک روز حشر نظم کر دیا جائے تو یہ حدود خداوندی میں داخل ہوجانے کے مترادف ہوگا۔ شاعر اسی وقت اس غلو سے بچ سکتا ہے جب اسے حضور اکرم ﷺ کی حقیقی عظمتوں کا دھیان ہو اور یہ احساس ہو کہ حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات اللہ اور انسان کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے شعر، مطالعۂ قرآن و حدیث اور مشاہدہ کائنات کے ذریعے ہی آپ کی حقیقی عظمت کی بارگاہ میں حسن قبول کا مرتبہ پاسکتے ہیں۔ خاص طور سے گیت کا آہنگ نعت گوئی کے لیے نا مناسب بتا کر اس ذریعۂ اظہار سے گریز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جس میں ''تورے عشق کے چھتے''، ''رورو عمر کا ساون بیتے'' پانی بھی آگ لگائے اور ''یا نبیؐ توری یاد آئے''، ''یا پنگھٹ پر محمدؐ کے کھڑا'' رہنے والے ٹکڑے کسی طور سے بھی نعت کا مہذب طریقۂ اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ کشفی کا یہ بیان درست ہے کہ ہم نعت میں جو لفظ بھی ادا کرتے ہیں ان سے نبی کریم ﷺ اور نبوت و رسالت کے بارے میں ہماری فکر اور دائرۂ تفہیم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ الفاظ معنی کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں اور بڑا شاعر الفاظ و معنی کی دنیا میں تجدید و تفسیر کا علم بردار ہوتا ہے اچھا شاعر عام الفاظ کو نئے معنی عطا کرتا ہے۔ اور زبان کے مزاج اور حدود کے اندر رہتے ہوئے نئے الفاظ اختراع و ایجاد کرتا ہے۔

اس کتاب کا صرف واحد مضمون ایسا ہے جو غیر مطبوعہ تھا اور وہ ہے صبیح رحمانی کی ایک نعت ''ہیں مواجہ پہ

اور جو آپ کے مرتبۂ عظیم کے شایان شان ہو۔ ویسے بہت سے شعر خوب
صورت ہونے کے باوجود نعت کے شعر نہیں کہے جاسکتے۔

دوسرے مضامین ''نعت کے عناصر'' اور ''نعت کے موضوعات'' بھی بڑے دلچسپ معلومات افزا اور فکر انگیز ہیں جن میں نعت کے موضوعات اور گھسے پٹے خیالات اور انداز کو بار بار دہرانے والے شعرا کو مخاطب کرکے یہ فرمایا گیا ہے کہ نعت میں مروّجہ الفاظ اور انداز تخاطب اختیار کرنے سے قبل ان کے معانی ومطالب پر بھی غور کرنا چاہیے صرف اندھی تقلید سے نعت گوئی کا حق ادا نہیں ہوتا اور کوئی خاص تأثر و کیفیت کی نمو نہیں ہوتی۔ ''کالی کملی والے''۔ ''داتا کے بھکاری''، ''خواہش وصل''، ''حلقہ گیسو'' جیسے الفاظ نعت میں استعمال کرنا۔ ناروا اور نامناسب ہیں۔ دوسرے انبیا علیہم السلام اور حضرت جبرئیل کی تحقیر کسی طور سے بھی جائز نہیں۔ نعت کی حدود کو بلاوجہ وسیع کرنے کی کوشش اور موضوعات میں اضافہ کرنے کی بے جا خواہش ایسے ہی مضامین نظم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے جس سے اسلامی نقطۂ نگاہ اور شریعت کے بنیادی اصولوں پر زد پڑتی ہے، مثلاً شافع روز حشر کو اگر مالک روز حشر نظم کر دیا جائے تو یہ حدود خداوندی میں داخل ہوجانے کے مترادف ہوگا۔ شاعر اسی وقت اس غلو سے بچ سکتا ہے جب اسے حضور اکرم ﷺ کی حقیقی عظمتوں کا دھیان ہو اور یہ احساس ہو کہ حضور ﷺ کی ذاتِ بابرکات اللہ اور انسان کے درمیان رابطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے شعر، مطالعۂ قرآن و حدیث اور مشاہدہ کائنات کے ذریعے ہی آپ کی حقیقی عظمت کی بارگاہ میں حسن قبول کا مرتبہ پاسکتے ہیں۔ خاص طور سے گیت کا آہنگ نعت گوئی کے لیے نا مناسب بتا کر اس ذریعۂ اظہار سے گریز کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے جس میں ''تورے عشق کے چھتے''، ''رورو عمر کا ساون بیتے'' پانی بھی آگ لگائے اور ''یا نبیؐ توری یاد آئے''، ''یا پنگھٹ پر محمدؐ کے کھڑا'' رہنے والے ٹکڑے کسی طور سے بھی نعت کا مہذب طریقۂ اظہار نہیں کیا جاسکتا۔ کشفی کا یہ بیان درست ہے کہ ہم نعت میں جو لفظ بھی ادا کرتے ہیں ان سے نبی کریم ﷺ اور نبوت و رسالت کے بارے میں ہماری فکر اور دائرۂ تفہیم کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ الفاظ معنی کی ایک دنیا اپنے اندر رکھتے ہیں اور بڑا شاعر الفاظ ومعنی کی دنیا میں تجدید وتفسیر کا علم بردار ہوتا ہے اچھا شاعر عام الفاظ کو نئے معنی عطا کرتا ہے۔ اور زبان کے مزاج اور حدود کے اندر رہتے ہوئے نئے الفاظ اختراع و ایجاد کرتا ہے۔

اس کتاب کا صرف واحد مضمون ایسا ہے جو غیر مطبوعہ تھا اور وہ ہے صبیح رحمانی کی ایک نعت ''ہیں مواجہ پہ ہم'' سے متعلق ہے جن کے نام سے اس مبارک تصنیف کو معنون بھی کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جوہر قابل کے دانندہ ہیں اور صبیح رحمانی کی ذہانت و ذکاوت کے معترف بھی۔ جب ہی تو اس کتاب کا انتساب بھی صبیح رحمانی کے نام کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ حق بہ حقدار رسیّد کے مقولے کا پاس رکھتے ہیں۔ کشفی صاحب نے۔ بڑے وثوق و اعتماد سے یہ بات کہی ہے کہ ''ادب پر ہوائی'' یا باد ہوائی گفتگو بہت آسان ہے لیکن فن پارے کو اپنے وجود میں محسوس کرنا اور اس احساس کو لفظ دے کر دوسروں کو اپنی فکر، نظر اور تنقیدی تجزیے میں شامل کرنا مشکل بات ہے۔ انھوں نے اس بات کی صداقت کا یوں ثبوت پیش کیا ہے کہ مواجہ کی کیفیت کو اپنے وجود میں محسوس کرکے بڑے عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں اپنے تأثرات خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی اسی تصنیف ''نعت اور تنقید نعت'' میں کہیں تحریر کیا ہے کہ کبھی تو شاعر کو خود بھی اس کے اپنے کہے ہوئے شعر کے معنی منکشف نہیں ہوئے۔ میرا خیال ہے جس دُرون بینی اور گہرائی میں جا کر اس نعت کا مطالعہ اور تجزیہ انھوں نے کیا ہے وہ اسی مقولے کی جیتی جاگتی اور منھ بولتی تصویر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''صبیح نے اس نغمے کی تشکیل کے وقت اس بات کا التزام نہیں کیا ہوگا۔ ایسے نغمے تو آدمی کی روح میں۔ ربّ صوت و آہنگ، مالک حرف ونوا اور خالقِ اظہار و بیان رکھ دیتا ہے۔ یہ صوت و آہنگ آدمی کے ساتھ ساتھ نشو ونما پاتی ہے۔ اور پھر کسی لمحے اس کا اظہار ہوجاتا ہے'' اس سلسلے میں یہ بیان کتنا اثر انگیز اور ایمان افروز ہے کہ ''مواجہ سرورِ کائنات ﷺ کا تجلی خانہ ہے یہ مقامِ خلوت بھی ہے اور مقامِ جلوت بھی۔'' لوگوں کے اضطراب، شوق آشفتگی، حیرانگی اور نفس گم کر دی پر جب نظر جاتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ یہاں جذبات وفکر کے دائرے حاضرین کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتے ہیں۔ عالم استعجاب و تحیر ماضی سے حال تک کے تمام اوراق الٹ کر بتاتا ہے کہ اے شخص! اپنی چشم بصیرت کا یہ عالم، عالمِ خواب نہیں بلکہ وہ ذاتِ پُرنور تیرے سامنے جلوہ افروز ہے کہ جس نے اپنی امت سے وعدہ کیا ہے کہ میں ہر اس شخص کے سلام کا جواب دوں گا جو میرے روضے پر آ کر سلام بھیجے گا۔ مواجہ شریف پر پہنچ کر صبیح رحمانی نے اپنے قلب کی کیفیت کا اظہار نظم کے قالب میں پیش کیا ہے۔ اور نثر میں کشفی نے اس کی وضاحت اس طریقے سے کی ہے کہ الفاظ اور بین السطور کے مفاہیم مکمل طور پر قاری کے ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ وہاں کی یہی کیفیت ہے جس نے انھیں یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ آدمی یہاں تماشائی بن کر حرف ونوا کو چراغ بنتے دیکھتا ہے۔ ''مواجہ میں'' اور ''مواجہ پر'' کے باریک و نازک فرق کو

بھی بڑی چابک دستی سے بیان کیا گیا ہے اس نازک فرق کی وضاحت شاعر کی دلی کیفیات و جذبات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کی گئی ہے۔ یہ وضاحت ان کے اپنے قلب کی کیفیت کی بھی آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کے حاضرین کے کانوں میں ایک نغمہ گونجنے لگتا ہے۔ یہ نغمہ صرف کانوں میں گونجتا نہیں بلکہ وجود پر برستا ہے یا رس رس کر وجود کی اندرونی تہوں تک پہنچتا ہے اپنے خیالات کے علاوہ وجدان اور کیف و سرور کا ذکر کرتے ہوئے اس نعت کے لب و لہجے اور آہنگ کے متعلق یہ عجیب انکشاف کیا ہے کہ اس نعت کے لفظ ''ہم'' کو کھینچ کر پڑھیے اور آنکھ بند کر محسوس کیجیے ''ہم'' کی گونج میں ایک ایسی موسیقیت کا ظہور ہوتا ہے کہ اس کی گونج سے اسمِ محمد ﷺ ادا ہو رہا ہے۔ یہ موسیقیت اور نغمگی اسی شخص کو محسوس ہوگی جسے مسجد نبوی۔ مواجہ شریف اور محمد ﷺ کے حضور کیف و سرور کی لازوال فضا میں گم ہونے کی نعمت سے سرفراز ہونے کا شرف عطا کیا گیا ہو۔ ایسی ہی نغمگی اور موسیقیت کے لیے رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے کہا تھا:

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

آخر میں پوری گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ پونے دو سو صفحات کی یہ مختصر سی تصنیف بڑے بڑے ضخیم پی ایچ۔ ڈی مقالات پر بھاری ہے چند مقالات میں شاعری کی مختلف اصنافِ نظم و غزل الفاظ و بیان کے علاوہ سوانح، تذکرہ نگاری، تاریخ، قرآنی تفسیر، سیرتِ نبوی ﷺ اور دیگر جملہ موضوعات پر بھی سرسری سا تذکرہ و تبصرہ ملتا ہے۔ تنقید اور اس کی تفہیم کے زرّیں اصول سے بھی آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ مزید برآں اردو شعرا ادب کے نامور و نمائندہ اشخاص کا ذکر بھی کسی نہ کسی عنوان سے اس تصنیف میں آ گیا ہے۔

ایک اور بہت اہم بات اس وقیع کتاب کی یہ ہے کہ کشفی نے حق شناسی۔ راست گوئی اور حق نویسی کا میعار کسی طرح بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کے ضمیر کی آواز نے قلم کی عظمت و حرمت کو برقرار رکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم جن کے متعلق خود کشفی نے لکھا ہے کہ وہ ہمارے نثری ادب کی آبرو ہیں۔ مگر ''نقوشِ اقبال'' مصنفہ سیّد ابو الحسن علی ندوی میں وہ جب اپنے دیباچہ میں نعتِ رسول مقبول ﷺ کو صحف سماوی کے مدِ مقابل لاکر پیش کرتے ہیں اور نعت کو کلام اللہ کی

بھی بڑی چابک دستی سے بیان کیا گیا ہے اس نازک فرق کی وضاحت شاعر کی دلی کیفیات و جذبات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کی گئی ہے۔ یہ وضاحت ان کے اپنے قلب کی کیفیت کی بھی آئینہ دار ہے۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا ہے کہ یہاں کے حاضرین کے کانوں میں ایک نغمہ گونجنے لگتا ہے۔ یہ نغمہ صرف کانوں میں گونجتا نہیں بلکہ وجود پر برستا ہے یا رس رس کر وجود کی اندرونی تہوں تک پہنچتا ہے اپنے خیالات کے علاوہ وجدان اور کیف و سرور کا ذکر کرتے ہوئے اس نعت کے لب ولہجے اور آہنگ کے متعلق یہ عجیب انکشاف کیا ہے کہ اس نعت کے لفظ ''ہم'' کو کھینچ کر پڑھیے اور آنکھ بند کر محسوس کیجیے ''ہم'' کی گونج میں ایک ایسی موسیقیت کا ظہور ہوتا ہے کہ اس کی گونج سے اسمِ محمد ﷺ ادا ہو رہا ہے۔ یہ موسیقیت اور نغمگی اسی شخص کو محسوس ہوگی جسے مسجد نبوی۔ مواجہ شریف اور محمد ﷺ کے حضور کیف و سرور کی لازوال فضا میں گم ہونے کی نعمت سے سرفراز ہونے کا شرف عطا کیا گیا ہو۔ ایسی ہی نغمگی اور موسیقیت کے لیے رئیس المتغزلین حضرت جگر مرادآبادی نے کہا تھا:

نغمہ وہی ہے نغمہ کہ جس کو
روح سنے اور روح سنائے

آخر میں پوری گفتگو کو سمیٹتے ہوئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ پونے دو سو صفحات کی یہ مختصر سی تصنیف بڑے بڑے ضخیم پی ایچ۔ ڈی مقالات پر بھاری ہے چند مقالات میں شاعری کی مختلف اصنافِ نظم و غزل الفاظ و بیان کے علاوہ سوانح، تذکرہ نگاری، تاریخ، قرآنی تفسیر، سیرتِ نبوی ﷺ اور دیگر جملہ موضوعات پر بھی سرسری سا تذکرہ و تبصرہ ملتا ہے۔ تنقید اور اس کی تفہیم کے زرّیں اصول سے بھی آشنائی حاصل ہوتی ہے۔ مزید برآں اردو شعرا ادب کے نامور و نمائندہ اشخاص کا ذکر بھی کسی نہ کسی عنوان سے اس تصنیف میں آ گیا ہے۔

ایک اور بہت اہم بات اس وقیع کتاب کی یہ ہے کہ کشفی نے حق شناسی۔ راست گوئی اور حق نویسی کا معیار کسی طرح بھی مجروح نہیں ہونے دیا۔ ان کے ضمیر کی آواز نے قلم کی عظمت و حرمت کو برقرار رکھا ہے۔ رشید احمد صدیقی جیسے صاحب قلم جن کے متعلق خود کشفی نے لکھا ہے کہ وہ ہمارے نثری ادب کی آبرو ہیں۔ مگر ''نقوشِ اقبال'' مصنفہ سیّد ابوالحسن علی ندوی میں وہ جب اپنے دیباچہ میں نعتِ رسول مقبول ﷺ کو صحف سماوی کے مدِمقابل لاکر پیش کرتے ہیں اور نعت کو کلام اللہ کی طرح لازوال مقصود کرتے ہیں تو ابوالخیر کشفی ان کو بھی اپنی تنقید سے بالاتر نہیں خیال کرتے اور یہ کہنے سے دریغ نہیں کرتے کہ نعت کو صحف سماوی کے مانند لازوال کہنا نیت کی صداقت کے باوجود زیادتی ہے۔ صہبا اختر اور دوسرے شعرا جنھوں نے نعت کی مقدس حدود اور اس کے آداب سرحدیں پھلانگ ڈالی ہیں اور بدعت کے خارزار کو نعت کے سبزہ زار میں کھینچ لاکر اپنے کمال فن کی ناکام کوشش کی ہے۔ انھیں ایک لمحہ کے لیے قابل قبول نہیں اس سے ان کی صحیح فکر۔ راست گوئی اور قلمی دیانت و درایت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

حمد اور نعت کے سلسلے میں ''تو'' اور ''آپ'' کے استعمال پر اکثر اوقات بحث وتمحیص ہوا کرتی ہے اس سلسلے میں بھی بڑے محققانہ انداز میں مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ '' تو'' اور ''آپ' حضور اکرم ﷺ کی نعت میں استعمال کرنے سے کوئی تحقیر کا پہلو نہیں نکلتا۔ یہ اور بات ہے کہ جن صاحبان کے خیال میں ''تو'' کے لفظ میں گستاخی ہے ان کے لیے'' تو'' کا استعمال ممنوع بلکہ حرام ہے البتہ عام زندگی میں ''تو'' نے تم اور'' آپ'' کے لیے جگہ خالی کر دی ہے۔ لیکن تو کا لفظ آج بھی دنیائے شعر و شاعری میں محبت اور اپنائیت کی نشانی ہے اس لیے اسے شجر ممنوعہ نہ خیال کرنا چاہیے۔ دراصل یہ تصنیف نعت گویوں کے لیے خصوصاً اور جملہ نقادانِ علم و ادب کے لیے عموماً ایک داعیہ اور انتباہیہ بھی ہے کہ ذکرِ رسول ﷺ کو اتنا آسان نہ تصور کریں کہ ادب اور شریعت کے تمام حدود ختم کردیں اور اپنے قلم کی جنبش کو فیل بے زنجیر کی طرح آزاد چھوڑ دیں۔

اس وقت مجھے الہ آباد یونی ورسٹی کی اپنی طالبعانہ زندگی کا وہ زمانہ یاد آ گیا جس میں ایم کام کی آڈیٹنگ کی کلاس میں پروفیسر نے ایک انگریز مصنف کا آڈیٹر کے متعلق یہ ضرب المثل جملہ دہرایا کہ:

"Auditor is a watch doz not a blood hound"

تو ڈاکٹر کشفی مجھے اس قسم کے ایک مذہبی تنقیح نگار نظر آئے جنھوں نے اپنا مزاج نعتِ رسول ﷺ کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے بنا رکھا ہے اور اربابِ قلم کو متنبہ کرنا اپنا فریضہ تصور کیا ہے۔ مگر کسی کی سرزنش کیلئے اپنے دستِ حق پرست میں تنبیہ الغافلین کا عصا نہیں اٹھا رکھا۔

جس طرح کشفی نے صبیح رحمانی اور سلیم کوثر کی خوب صورت نعت اور دل فریب اشعار کی تعریف و توصیف میں اپنی جادو بیانی سے کام لیا ہے میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی انھیں کے چند خوب صورت جملوں کو نقل

کر کے قارئین کے ذوق مطالعہ سے تحسین و آفرین کے کلمات حاصل کر کے اپنے کاسۂ سوال کو پُر کر لوں۔
ملاحظہ فرمایئے:

محسن کا کوردی کی مثنویاں ہماری نعتیہ شاعری کے شب افروز ہیروں کا درجہ رکھتے ہیں۔

نعت کے شعروہ پھول ہیں جن پر حبِ نبی ﷺ کا آب حیات شادابی پر کملاہٹ کا اثر نہ ہو۔

آدمی تکلف و تصنع کی بے ساکھیوں کے سہارے جدّت کی کاوش میں مبتلا نہ ہو بلکہ اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ حریم ذہن اور خلوت سرائے دل کو محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یاد اور تذکرے کے لیے وقف کر دے۔

شاعر کے باطن سے ابھرتا ہوا رنگ و نور عطا اور رحمت کا یہ موسم نعت کو ایسا نقش مزین بنا دیتا ہے جس میں وہ سارے رنگ موجود ہوتے ہیں۔جن کا کوئی نام دنیا کی کسی زبان میں نہیں''،''نسبتِ محمدی ﷺ مٹی کو سونا،فسق و فجور کو تقویٰ اور زمین کو آسمان بنا دیتی ہے۔

ادیب و شاعر کا وسیلۂ اظہار اور متاعِ ہنر لفظ ہیں۔

آدمی جب بھی محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے اللہ کے تصور اور خیال سے ہم کنار ہو جاتا ہے اسی سفر میں وہ جوار رحمۃ للعالمین میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

آفاقی اور اعلیٰ شاعری کے عناصر ہی نعت کے عناصر ہیں۔

ان کے خاک پا سے مس ہو کر ہر لفظ آئینہ صفت اور قیمت میں روکش لعل و گہر ہو جاتا ہے۔

اسی لیے تو اس عہد کے ممتاز شاعر کالم نگار اور ادیب سرشار صدیقی نے کشفی اور اس تصنیف کے حوالے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ''نعتیہ تصانیف کے عصری ہجوم میں یہ کتاب اس لیے بھی منفرد و ممتاز ہے کہ

کر کے قارئین کے ذوق مطالعہ سے تحسین و آفرین کے کلمات حاصل کر کے اپنے کاسۂ سوال کو پُر کر لوں۔

ملاحظہ فرمایئے:

محسن کا کوردی کی مثنویاں ہماری نعتیہ شاعری کے شب افروز ہیروں کا درجہ رکھتے ہیں۔

نعت کے شعروہ پھول ہیں جن پر حبِ نبی ﷺ کا آب حیات شادابی پر کملاہٹ کا اثر نہ ہو۔

آدمی تکلف و تصنع کی بے ساکھیوں کے سہارے جدّت کی کاوش میں مبتلا نہ ہو بلکہ اپنے وجود کی سچائیوں کے ساتھ حریم ذہن اور خلوت سرائے دل کو محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ و السلام کی یاد اور تذکرے کے لیے وقف کر دے۔

شاعر کے باطن سے ابھرتا ہوا رنگ و نور عطا اور رحمت کا یہ موسم نعت کو ایسا نقش مزین بنا دیتا ہے جس میں وہ سارے رنگ موجود ہوتے ہیں۔ جن کا کوئی نام دنیا کی کسی زبان میں نہیں''، ''نسبتِ محمدی ﷺ مٹی کو سونا، فسق و فجور کو تقویٰ اور زمین کو آسمان بنا دیتی ہے۔

ادیب و شاعر کا وسیلۂ اظہار اور متاع ہنر لفظ ہیں۔

آدمی جب بھی محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے اللہ کے تصور اور خیال سے ہم کنار ہو جاتا ہے اسی سفر میں وہ جوار رحمۃ للعالمین میں بھی پہنچ جاتا ہے۔

آفاقی اور اعلیٰ شاعری کے عناصر ہی نعت کے عناصر ہیں۔

ان کے خاک پا سے مس ہو کر ہر لفظ آئینۂ صفت اور قیمت میں روکش لعل و گہر ہو جاتا ہے۔

اسی لیے تو اس عہد کے ممتاز شاعر کالم نگار اور ادیب سرشار صدیقی نے کشفی اور اس تصنیف کے حوالے سے کیا اچھی بات کہی ہے کہ ''نعتیہ تصانیف کے عصری ہجوم میں یہ کتاب اس لیے بھی منفرد و ممتاز ہے کہ اس کے کسی مصرے یا موضوع پر روایتی نعت کا سایہ نہیں ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب بذات خود ایک زندہ روایت کی طرح ایک عہد ساز کردار ادا کرے گی۔''

اردو ادب کے اشاعتی سرمایے میں ابھی تک ''اشاریے'' کی جس قدر قلت محسوس کی جاتی ہے اور محققین کو اپنی تحقیق کے سلسلے میں جتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کے پیشِ نظر یہاں ان اصحاب کے اسمائے گرامی نقل کیے جا رہے ہیں جن کا کسی نہ کسی حوالے سے اس تصنیف میں سرسری سا تذکرہ موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ میرا یہ فعل کسی کو عبث و بے کار معلوم ہو مگر میری نیت یہ ہے کہ کچھ عجب نہیں کہ نبیٔ رحمت ﷺ کے اس تذکار میں اس شخص پر بھی قدرت خداوندی اپنی بارش کرم کر دے جس کا صرف نام لیا گیا ہے کیوں کہ وہ تمام عالم کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں اور:

جو تیری گلی سے گزر گیا وہ برا بھی ہو تو برا نہیں

یہ اصحاب درج ذیل ہیں:

قلی قطب شاہ، ملا وجہی، ولی دکنی، ہاشمی دکنی، میر تقی میر، سودا، مصحفی، غالب، سرسیّد، حالی، شبلی، ڈپٹی نذیر احمد، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی، جگر مراد آبادی، حسرت موہانی، محسن کا کوروی، میرامن، اقبال، ظفر علی خاں، اکبر الہ آبادی، مہدی الافادی، احسان دانش، یاس یگانہ چنگیزی، اقبال سہیل، اختر حیدرآبادی، امجد حیدرآبادی، امیر مینائی، ریاض خیرآبادی، جوش ملیح آبادی، حفیظ جالندھری، حفیظ ہوشیار پوری، عبدالرحمٰن بجنوری، تابش دہلوی، ماہرالقادری، ذوالفقار علی بخاری، فیض احمد فیض، معین احسن جذبی، مجاز لکھنوی، سراج الدین ظفر، مومن خاں مومن، عابد علی عابد، محمد علی جوہر، نسیم دہلوی، آغا شاعر، عظمت اللہ خان مطلبی فریدآبادی، آرزو لکھنوی، کرامت علی شہیدی، عبدالحلیم شرر، بہزاد لکھنوی، حمید لکھنوی، خواجہ حسن نظامی، اختر الایمان، عبدالعزیز خالد، حنیف اسعدی، حفیظ تائب، ش ضحیٰ، ناصر کاظمی، سرشار صدیقی، ریاض مجید، رئیس علوی، محسن احسان، ابن انشاء، نگار صہبائی، نعیم صدیقی، مظفر وارثی، جمیل الدین عالی، کلیم عاجز، عبدالقیوم ناشاد، آفتاب کریمی، صہبا اختر، نسیم خواجہ، رضی اختر شوق، فہیم فرید، سلیم کوثر، جلیل عالی جمیل نقوی، صبیح رحمانی، عزیز لکھنوی، فضل احمد کریم فضلی، پیرزادہ قاسم، عثمان رمز، امتیاز ساغر، شیر افضل جعفری، عرش صدیقی، ثروت حسین، اطہر نفیس، سعید وارثی، قمر ہاشمی، شفیق بریلوی، ہاجرہ مسرور، رشید وارثی، ضمیر اظہر قمر انجم، ن م راشد، شہزاد احمد، راجا رشید محمود، احمد مقبول پوری، قاضی اختر جوناگڑھی، مجنوں گورکھ پوری،

حسن عسکری، رشید احمد صدیقی، عبدالرحمٰن بجنوری، حامد حسن قادری، امداد امام اثر، عبادت بریلوی، کلیم الدین احمد، فراق گورکھ پوری، دتاتریا کیفی، گوپی چند نارنگ، والیٹر، نطشے، ٹیگور، سقراط، ارسطو، البیرونی، ابن خلدون، ٹی ایس ایلیٹ، فاکر، الفریڈ کوازبسکی، ایملی ڈکنن۔

حضرت نظام الدین اولیا، خواجہؒ بختیار کاکی، سیّد احمد شہیدؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادرؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا مودودیؒ، سیّد ابوالحسن علی ندوی رشید ترابی، خواجہ حافظ، چراغ دہلوی، غزالی، عراقی، جامی، فتح محمد جالندھری، بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف۔

اس کے علاوہ ان نعت خواں حضرات کے نام بھی اس کتاب میں مل جاتے ہیں جنھوں نے نعت خوانی میں اپنا مقام پیدا کر رکھا ہے۔ اعظم چشتی۔ قاری وحید ظفر قاسمی، خورشید احمد، صدیق اسمٰعیل، منیبہ شیخ، ام حبیبہ۔

حسن عسکری، رشید احمد صدیقی، عبدالرحمٰن بجنوری، حامد حسن قادری، املاد امام اثر، عبادت بریلوی، کلیم الدین احمد، فراق گورکھ پوری، دتاتریا کیفی، گوپی چند نارنگ، والیٹر، نطشے، ٹیگور، سقراط، ارسطو، البیرونی، ابن خلدون، ٹی ایس ایلیٹ، فاکر، الفریڈ کوازبسکی، ایملی ڈکنن۔

حضرت نظام الدین اولیا، خواجہؒ بختیار کاکی، سیّد احمد شہیدؒ، شیخ الہند محمود الحسنؒ، شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادرؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا احمد رضا خان بریلویؒ، مولانا مودودیؒ، سیّد ابوالحسن علی ندوی رشید ترابی، خواجہ حافظ، چراغ دہلوی، غزالی، عراقی، جامی، فتح محمد جالندھری، بے نظیر بھٹو اور میاں نواز شریف۔

اس کے علاوہ ان نعت خواں حضرات کے نام بھی اس کتاب میں مل جاتے ہیں جنھوں نے نعت خوانی میں اپنا مقام پیدا کر رکھا ہے۔ اعظم چشتی۔ قاری وحید ظفر قاسمی، خورشید احمد، صدیق اسمٰعیل، منیبہ شیخ، ام حبیبہ۔

ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ

نعت اور تنقیدِ نعت

مذہب انسانی شخصیت کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ ڈاکٹر سیّد محمد ابوالخیر کشفی کی ذات اُردو زبان و ادب پر جو دسترس رکھتی ہے، وہ محتاج تعارف نہیں۔ حجِ بیت اللہ اور روضۂ رسول ﷺ کی زیارت نے اُردو زبان و ادب کی تحقیق و کھوج کے سلسلے کو مزید وسعت دی۔ ’’وطن سے وطن تک‘‘ حجاز مقدس کا وہ پر کیف اور دل نشین سفرنامہ ہے کہ جسے پڑھتے ہی سرزمینِ حجاز کی جانب ذوق سفر اور فزوں ہوتا ہے۔ ’’مسلمانوں کی زندگی کیا ہے؟‘‘، ’’تعارفِ اسلام‘‘، ’’حیاتِ محمد ﷺ قرآن حکیم کے آئینے میں‘‘، ’’ذکرِ نبی کریم ﷺ اُردو ادب میں‘‘، نعتیہ مجموعہ ’’نسبت‘‘ اسلامی ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ’’نعت اور تنقیدِ نعت‘‘ ان مضامین کا مجموعہ ہے جو ’’نعت رنگ‘‘ میں شائع ہوئے۔ کشفی صاحب جابجا طور پر اس امر پر فخر کرسکتے ہیں کہ ان مضامین کی اشاعت کی بنا پر اُردو ادب میں صنف نعت کی اہمیت کو تسلیم کیا گیا اور ناقدین فن نے اس پر توجہ دی۔ صنفِ نعت اور نعت نگاری کے سلسلے میں معانی، اسلوبیات اور لسانیات کی طرف یکساں توجہ نے اس کتاب کی وقعت میں اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب میں چھ مضامین نعت کے عناصر، نعت کے موضوعات، نعت گنجینۂ معنی کا طلسم، غزل میں نعت کی جلوہ گری اُردو میں نعت کا مستقبل اور ایک مختصر تاثراتی تحریر ہیں مواجہ پہ ہم شامل ہیں۔

’’نعت کے عناصر‘‘ میں کشفی صاحب کی اس رائے سے صرف نظر ممکن نہیں بڑی شاعری چہار سمتی مکالمہ ہے۔ شاعر کا مکالمہ اپنے رب کے ساتھ اور مسلمان شاعر کے مکالمے میں اس سطح میں خالق کائنات بھی شامل ہیں۔ شاعر کا مکالمہ عالمِ انسانیت سے اور شاعر کا مکالمہ اپنی ذات سے زبان کے خمیر میں یہ بات شامل ہے کہ ایک سے زیادہ جہتوں اور سطحوں کے مکالمے ایک ہی شعر یا شعری تخلیق میں آجائیں۔‘‘ اس

بات کی توثیق اس کتاب کے چوتھے مضمون ''غزل میں نعت کی جلوی گری'' سے ہوتی ہے یہاں وہ کہتے ہیں کہ جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد اور نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کشفی صاحب نے میر، غالب، اقبال، فیض، اور کئی دوسرے جدید شعرا کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جن کا شمار غزل کے بہترین اشعار میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ان میں مدحتِ رسول ﷺ کے مہکتے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں معنوی قرائین انھیں نعتیہ اشعار کی صنف میں لے آئیں ہیں۔

مرزا غالب نے تجمل حسین خان کی مدح میں جو غزل کہی:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

تو ہر ذہن رسول کریم ﷺ کی طرف جائے گا نہ کہ تجمل حسین خاں کی جانب۔ پھر اقبال کا مشہور شعر:

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی

کب ذہن میں آیا کہ اس شعر کی نسبت رسول کریم ﷺ سے قائم کی جاسکتی ہے اور جب اس پر سوچا تو معنی کے نئے نئے دروا ہوئے۔ کھلا کہ حسرت نے جنوں کا لفظ آپؐ سے شدید وابستگی کے نتیجے میں استعمال کیا ہے۔

فیض اس عہد کے اہم ترین شعرا میں سے ایک ہیں کشفی صاحب اس امر سے آزردہ ہوئے کہ اتنے بڑے شاعر مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے خود درسِ قرآن حکیم دینے والے نماز کی امامت کی سعادت بھی حاصل کی۔ بڑی تعداد میں شعری تخلیقات کی موجودگی کے باوجود نعت کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوئے۔ یہ بات جو دل میں کھٹکتی تھی۔

ٹیلی وژن کے ایک مذاکرے میں لبوں تک آگئی کہ عصرِ موجود کے ایک بڑے اور اہم مشاعرے کے کلام میں نعت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ سننے والے سبھی سمجھ گئے کہ اشارہ کس کی جانب ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی ملاقات فیض صاحب سے ہوئی۔ وہ کچھ رنجیدہ معلوم ہوئے۔ کشفی صاحب سب جانتے تھے۔ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ ناراضگی کا باعث دریافت کیا۔ فیض صاحب کا جواب دیکھیے۔

کسی گنہ گار یا خطا کار کے کانوں میں جو بات کہنی چاہیے۔ اس کو دنیا میں یوں پھیلانے کا خلقِ عظیم

بات کی توثیق اس کتاب کے چوتھے مضمون ''غزل میں نعت کی جلوہ گری'' سے ہوتی ہے یہاں وہ کہتے ہیں کہ جب بھی شاعر محدود سے لامحدود کی طرف سفر کرتا ہے تو وہ حمد اور نعت کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ کشفی صاحب نے میر، غالب، اقبال، فیض، اور کئی دوسرے جدید شعرا کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جن کا شمار غزل کے بہترین اشعار میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ان میں مدحتِ رسول ﷺ کے مہکتے پھول کھلتے دکھائی دیتے ہیں۔ یوں معنوی قرائین انھیں نعتیہ اشعار کی صنف میں لے آئیں ہیں۔

مرزا غالب نے تجمل حسین خان کی مدح میں جو غزل کہی:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

تو ہر ذہن رسول کریم ﷺ کی طرف جائے گا نہ کہ تجمل حسین خاں کی جانب۔ پھر اقبال کا مشہور شعر:

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ
ترے پیمانے میں ہے ماہ تمام اے ساقی

کب ذہن میں آیا کہ اس شعر کی نسبت رسول کریم ﷺ سے قائم کی جاسکتی ہے اور جب اس پر سوچا تو معنی کے نئے نئے دروا ہوئے۔ کھلا کہ حسرت نے جنوں کا لفظ آپؐ سے شدید وابستگی کے نتیجے میں استعمال کیا ہے۔

فیض اس عہد کے اہم ترین شعرا میں سے ایک ہیں کشفی صاحب اس امر سے آزردہ ہوئے کہ اتنے بڑے شاعر مذہبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے خود درسِ قرآن حکیم دینے والے نماز کی امامت کی سعادت بھی حاصل کی۔ بڑی تعداد میں شعری تخلیقات کی موجودگی کے باوجود نعت کی طرف کیوں متوجہ نہ ہوئے۔ یہ بات جو دل میں کھٹکتی تھی۔

ٹیلی وژن کے ایک مذاکرے میں لبوں تک آ گئی کہ عصرِ موجود کے ایک بڑے اور اہم مشاعرے کے کلام میں نعت کا جلوہ نظر نہیں آتا۔ سننے والے سبھی سمجھ گئے کہ اشارہ کس کی جانب ہے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کی ملاقات فیض صاحب سے ہوئی۔ وہ کچھ رنجیدہ معلوم ہوئے۔ کشفی صاحب سب جانتے تھے۔ تجاہلِ عارفانہ سے کام لیتے ہیں۔ ناراضگی کا باعث دریافت کیا۔ فیض صاحب کا جواب دیکھیے۔

کسی گنہ گار یا خطاکار کے کانوں میں جو بات کہنی چاہیے۔ اس کو دنیامیں یوں پھیلانے کا خلقِ عظیم محمدی ﷺ سے کیا تعلق اور آپ تو ادب کے استاد ہیں۔ کیا آپ اپنے طالب علموں کو اس بت ہزار شیوہ سے متعارف نہیں کراتے۔ جسے غزل کہتے ہیں۔ اگر آپ نے ہمدردی اور دل بیدار کے ساتھ میری غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو نعت کے اشعار مل جاتے اور اس مختصر گفتگو کے بعد فیض صاحب نے اپنا یہ شعر پڑھا:

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اور شاید یہ فیض صاحب ہی کا فیضانِ نظر ہے کہ غزل کی ماہیت کا یہ پہلو مجھ پر روشن تر ہوگیا اور غالباً مضمون اسی گفتگو کا نتیجہ ہے۔

فیض صاحب نے جس انداز سے بات کہی یہ انھیں کا خاصا ہے اور کشفی صاحب نے جس طرح اس کوتاہی کا برملا اعتراف کیا یہ انھی کا ظرف ہے۔ ۵۲ صفحات پر محیط اس طویل مقالے میں کشفی صاحب نے مدحتِ رسول ﷺ در اشعارِ غزل کی تلاش میں جس محبت اور کاوش سے کام لیا ہے وہ انھی سے مخصوص ہے۔ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ بیش تر شعرا کو خود بھی علم نہیں کہ وہ لاشعوری طور پر اس پاکیزہ ہستی سے نسبت و قرب کا اشارہ کر گئے ہیں جو ہمہ وقت ان کے دلوں میں بستی ہے۔ جس کا نام حرزِ جاں ہے، جو ہر ایک کے لیے اپنی اولاد اپنے ماں باپ سے بڑھ کر عزیز ہے۔

میر و غالب و اقبال و حسرت و فیض کے غزلیہ نعتیہ اشعار کے ساتھ ساتھ احمد ندیم قاسمی، سراج الدین ظفر، فضل احمد کریم فضلی، صہبا اختر، عرش صدیقی اور سلیم کوثر وغیرہ کے حوالے سے، کشفی صاحب رقم طراز ہیں کہ ہماری غزل کیسی مومنہ ہے کہ حبِ رسول ﷺ کے کوہِ گراں کو اس نے سنبھال رکھا ہے۔ چند ایک اشعار دیکھیے۔ ہم سرسری نگاہ سے مطالعہ کرنے والے کیا ان کی گہرائی تک پہنچ پائے تھے۔

آنکھ اس سے نہیں اٹھنے کی صاحب نظروں کی
جس خاک پہ ہوگا اثر اس کی کفِ پا کا
(میر)

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

(غالب)

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند

اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

(اقبال)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

(حسرت)

رنگ و خوش بو کے حسن و خوبی کے تم سے تھے جتنے استعارے تھے

(فیض)

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی ربِ کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے

(فیض)

فیض کا مذکورہ بالا شعر اگر حسرت موہانی کے اس بیان کی روشنی میں پرکھا جائے تو مفہوم زیادہ واضح ہوکر سامنے آتا ہے۔''... کہتے ہیں کسی نے ان (حسرت) سے پوچھا کہ مولانا آپ ہر سال حج کے لیے کیوں جاتے ہیں؟... مولانا نے سادگی سے فرمایا کہ میں تو اپنے جدامجد کے روضے پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں۔ راستے میں مکہ بھی آجاتا ہے تو حج بھی کرلیتا ہوں۔ ورنہ زندگی میں حج ایک بار فرض ہے۔(صفحہ ۱۲۹۔ نعت اورتنقیدِ نعت)

خدا کا شکر ترا راستہ معین ہے کہ کارواں بھی تمھی، میرِ کارواں بھی تمھی

(احمد ندیم قاسمی)

عرشِ بریں پہ شانِ خدا جھومنے لگی مردِ خدا کی عظمتِ کردار دیکھ کر

(شیر افضل جعفری)

یہ دشتِ خلد کس کی گزرگاہ ہے جو وہ کون کہ جس کا ہے یہ نقشِ کفِ پا چاند

(پیرزادہ قاسم)

یہاں مجھے حفیظ ہوشیار پوری کا یہ شعر یاد آرہا ہے:

غبار کا ہکشاں گردِ راہ ہے کس کی

(غالب)

تین سو سال سے ہیں ہند کے مے خانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

(اقبال)

نگاہِ یار جسے آشنائے راز کرے   وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

(حسرت)

رنگ و خوش بو کے حسن و خوبی کے   تم سے تھے جتنے استعارے تھے

(فیض)

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی   ربِ کریم ہے تو تری رہ گزر میں ہے

(فیض)

فیض کا مذکورہ بالا شعر اگر حسرت موہانی کے اس بیان کی روشنی میں پرکھا جائے تو مفہوم زیادہ واضح ہوکر سامنے آتا ہے۔ ''... کہتے ہیں کسی نے ان (حسرت) سے پوچھا کہ مولانا آپ ہر سال حج کے لیے کیوں جاتے ہیں؟... مولانا نے سادگی سے فرمایا کہ میں تو اپنے جدامجد کے روضے پر فاتحہ پڑھنے جاتا ہوں۔ راستے میں مکہ بھی آجاتا ہے تو حج بھی کرلیتا ہوں۔ ورنہ زندگی میں حج ایک بار فرض ہے۔(صفحہ ۱۲۹۔ نعت اور تنقیدِ نعت)

خدا کا شکر ترا راستہ معین ہے   کہ کارواں بھی تمھی، میرِ کارواں بھی تمھی

(احمد ندیم قاسمی)

عرشِ بریں پہ شانِ خدا جھومنے لگی   مردِ خدا کی عظمتِ کردار دیکھ کر

(شیر افضل جعفری)

یہ دشتِ خلد کس کی گزرگاہ ہے جو   وہ کون کہ جس کا ہے یہ نقشِ کفِ پا چاند

(پیرزادہ قاسم)

یہاں مجھے حفیظ ہوشیار پوری کا یہ شعر یاد آرہا ہے:

غبار کا ہکشاں گردِ راہ ہے کس کی
یہ کون منزلِ شمس و قمر سے گزرا ہے

نوجوان شعرا کے انتخاب کے سلسلے میں، آخر میں سلیم کوثر نے آپؐ کے شرفِ بشریت کو جس ایمان و ایقان کے ساتھ محسوس کیا اس کی جانب اشارہ کیا ہے:

وہ جس کی ذات سے سب عظمتیں منسوب ہیں ہم بھی
اسی اک شخص کو عالی نسب تسلیم کرتے ہیں

☆

اک نظر ہو تو کیا سے کیا ہوجاؤں
میں جو پتھر ہوں آئینہ ہوجاؤں
ان کی گلیوں کا قرض ہوں میں تو
دیکھیے کب وہاں ادا ہوجاؤں

''نعت گنجینۂ معنی کا طلسم'' کا ایک ایک نگینہ دعوتِ فکر دیتا ہے۔

اُردو میں نعت کا مستقبل کے عنوان سے ایک ریڈیائی فیچر میں شرکا اس بات پر متفق ہیں کہ نعت ہیئت میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی، مخمس، مسدس، آزاد نظم، نثری نظم، ہائیکو، ثلاثی، دوہے وغیرہ میں کہی گئی ہے اور آٹھویں عشرے میں نعت گوئی و نعت خوانی کو جو غیر معمولی عروج حاصل ہوا وہ روزمرہ بڑھ رہا ہے۔ مختلف محافل و رسائل میں نعت خوانی و نعت گوئی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ ماہ نامہ ''نعت''، ''نعت رنگ'' اور ''حمد و نعت'' خالص نعتیہ شاعری اور صنفِ نعت کے تحقیق و تعارف پر مبنی جراید نے نعت فہمی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نعتیہ محافل کا انعقاد، نعت گوئی کے انعامی مقابلوں کا اجرا، یہ سب نعت کے ذریعے، حضورﷺ سے ایک عام بشر کے قرب و نسبت کو واضح کرتے ہیں اور اس بات کا اعلان بھی کہ اُردو شاعری میں نعت کا مستقبل روشن ہے۔ ''نعت کے موضوعات'' میں مصنف نے نعت کے اہم اور غیر اہم موضوعات میں فرق کرتے ہوئے نعت گوئی کے آداب جس طرح بوصیری، سعدی، جامی، قدسی و ظفر علی خان نے سیکھے، اسے مدِنظر رکھتے ہوئے ہی آج کا شاعر نعت کہنے کا سلیقہ پاسکتا ہے۔

''نعت اور تنقیدِ نعت'' کا ایک ایک جملہ اپنی تاثیر اور تاثر کے سبب قاری کی توجہ اپنی جانب مرکوز رکھتا ہے۔ شاید ایسی ہی تحریر کو سحر طراز کہا جاتا ہے۔ بات کتنی ہی پیچیدہ اور مسئلہ کتنا ہی ژولیدہ کیوں نہ ہو، کس طرح

عام فہم انداز میں سمجھایا جاتا ہے۔ یہ نکتہ کشفی صاحب بخوبی جانتے ہیں۔ اس بات کے گواہ ان کے قارئین بھی ہیں اور ہم شاگرد بھی۔

عام فہم انداز میں سمجھایا جاتا ہے۔ یہ نکتہ کشفی صاحب بخوبی جانتے ہیں۔ اس بات کے گواہ ان کے قارئین بھی ہیں اور ہم شاگرد بھی۔

نذرِ ابوالخیر کشفی

وہ دکتور سیّد ابوالخیر کشفی
جو نقادِ اور شاعر خوش نوا ہے

قلم اور کاغذ سے اپنے مسلسل
جہان میں اُجالے وہ پھیلا رہا ہے

خدا بھی ہے خوش اس سے خلقِ خدا بھی
وہ محوِ ثنائے حبیبِؐ خدا ہے

ابوالخیر ہے خیر کی ہے علامت
وہ کشفی ہے بھیدوں کے در کھولتا ہے

مزاج اس کا ہے نور و نکہت سراسر
بہار انتساب و صبا ماجرا ہے

کئی رنگ اس شخص کے اور بھی ہیں
اور اس کا ہے جو رنگ، حیرت فضا ہے

ابوالخیر کشفی، ابوالخیر کشفی
عجب ورد جعفؔر قلم کر رہا ہے